علم الاقتصاد

جس کا

معروف نام علم سیاست مدن ہے

مصنفہ

شیخ محمد اقبال ایم اے اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج

لاہور

بکارخانہ پیسہ اخبار کے نادر لیتھو ایم سٹیم پریس لاہور میں منشی محمد عبدالعزیز مینیجر کے

اہتمام سے چھپا

IQBAL ACADEMY PAKISTAN LAHORE.
LIBRARY.
Acc. No. 25849

پیشکش

اِس دلی ارادت کے سبب جو مختصر سے زمانۂ تلمذ میں مجھے عالی جناب ڈبلیو۔ بل اسکوئر ڈائرکٹر محکمہ تعلیم پنجاب کی خدمت میں پیدا ہوئی جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور کی کرسیٔ صدارت پر رونق افروز تھے اور اِس عالمگیر شہرت کے باعث جو صاحب ممدوح کو بحیثیتِ مربیٔ علوم وفنون حاصل ہے میں اس ناچیز کتاب کو جو میری علمی کوششوں کا پہلا ثمر ہے صاحب موصوف کے نامِ نامی سے منسوب کرنا چاہتا ہوں اور اِس امید پر کہ یہ ہدیہ محتقر شرفِ قبول پائیگا۔ نہایت ادب سے اِسی پیشکش کرتا ہوں

مصنف

فہرست مضامین

مضامین	صفحہ
دیباچۂ مصنف	۱
حصہ اول - علم الاقتصاد اور اسکا طریق تحقیق -	۸
حصہ دوم - پیدائش دولت -	۲۸
باب اول - زمین	۳۷
باب دوم - محنت	۴۳
باب سوم - سرمایہ	۵۱
باب چہارم - کسی قوم کی قابلیت پیدائش دولت کے لحاظ سے -	۵۷
حصہ سوم - تبادلۂ دولت	۷۱
باب اول - مسئلۂ قدر	۷۱
باب دوم - تجارت بین الاقوام	۹۳
باب سوم - زر نقد کی ماہیت اور اس کی قدر -	۱۰۹
باب چہارم - حق الضرب -	۱۲۶
باب پنجم - زر کاغذی -	۱۳۶
باب ششم - اعتبار اور اس کی ماہیت -	۱۴۵
حصہ چہارم - پیداوار دولت کے حصہ دار -	۱۵۰
باب اول - لگان	۱۵۰
باب دوم - سود	۱۵۷
باب سوم - منافع	۱۶۳
باب چہارم - اجرت	۱۷۳
باب پنجم - مقابلۂ ناکامل کا اثر دستکاروں کی حالت پر -	۱۸۵
باب ششم - مالگذاری	۱۹۳
حصہ پنجم	۱۹۹
باب اول - آبادی و وجہ معیشت	۱۹۹
باب دوم - جدید ضروریات کا پیدا ہونا -	۲۰۹
باب سوم - صرف دولت	۲۱۴

تمام شد

دیباچۂ مصنف

علم الاقتصاد انسانی زندگی کے معمولی کاروبار پر بحث کرتا ہے اور اُسکا مقصد اِس امر کا تحقیق کرنا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کس طرح حاصل کرتے ہیں۔ اور اسکا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ پس ایک اعتبار سے تو اُسکا موضوع دولت ہے اور دوسرے اعتبار سے یہ اِس وسیع علم کے ایک شاخ ہے جسکا موضوع خود انسان ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ انسان کا معمولی کام کاج اِس کے اوضاع و اطوار اور اسکے طرز زندگی پر بڑا اثر رکھتا ہے۔ بلکہ اُسکے دماغی قوا بھی اس اثر سے کامل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیل رواں میں اصولِ مذہب بھی انتہا درجہ کا مؤثر ثابت ہوا ہے۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربے اور مشاہدہ کر ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے چپکے اسکے ظاہری اور باطنی قوا سے کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قوائے انسانی پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئنہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اسکا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلم اول یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدن انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے۔ مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج بجائے اِس کے کہ قیام تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو اِس کی تخریب کرتا ہے۔ اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اِس طرح اِس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے

کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کی دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کے دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے؟ اِس سوال کا شافی جواب دینا علم الاقتصاد کا کام نہیں کیونکہ کسی حد تک اسکے جواب کا انحصار انسانی فطرت کی اخلاقی قابلیتوں پر ہے جنکو معلوم کرنے کے لئے اِس علم کے ماہرین کوئی خاص ذریعہ اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتے۔ مگر چونکہ اِس جواب کا انحصار زیادہ تر ان واقعات اور نتائج پر بھی ہے جو علم الاقتصاد کے دائرۂ تحقیق میں داخل ہیں اِسواسطے یہ علم انسان کے لئے انتہا درجہ کی دلچسپی رکھتا ہے۔ اور اُسکا مطالعہ قریباً قریباً ضروریاتِ زندگی میں سے ہے۔ بالخصوص اہلِ ہندوستان کے لئے تو اِس علم کا پڑھنا اور اُسکے نتائج پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ یہاں مفلسی کی عام شکایت ہو رہی ہے۔ ہمارا ملک کامل تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اپنی کمزوریوں اور نیز اُن تمدنی اسباب سے بالکل ناواقف ہے۔ جنکا جاننا قومی فلاح اور بہبودی کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ انسان کی تاریخ اِس امر کی شاہد ہے کہ جو قومیں اپنی تمدنی اور اقتصادی حالات سے غافل رہی ہیں اُنکا حشر کیا ہوا ہے۔ ابھی حال میں مہاراجہ بروده نے اپنی ایک گراں بہا تقریر میں فرمایا تھا کہ اپنی موجودہ اقتصادی حالت کو سنوارنا ہماری تمام بیماریوں کا آخری نسخہ ہے۔ اور اگر یہ نسخہ استعمال نہ کیا گیا تو ہماری بربادی یقینی ہے۔ پس اگر اہلِ ہندوستان دفترِ اقوام میں اپنا نام قائم رکھنا چاہتے ہوں تو اُن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اِس اہم علم کے اُصولوں سے آگاہی حاصل کر کے معلوم کریں کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو ملکی عروج کے مانع ہو رہے ہیں

میری غرض ان اوراق کی تحریر سے یہ ہے کہ عام فہم طور پر اس علم کے نہایت ضروری اصول واضح کروں۔ اور نیز بعض بعض جگہ اس بات پر بھی بحث کروں کہ یہ عام اصول کہاں تک ہندوستان کی موجودہ حالت پر صادق آتے ہیں۔ اگر ان سطور سے کسی فرد واحد کو بھی ان معاملات پر غور کرنے کی تحریک ہو گئی تو میں سمجھونگا کہ میری دماغ سوزی اکارت نہیں گئی۔

اس دیباچے میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس کے مضامین مختلف مشہور اور مستند کتب سے اخذ کئے گئے ہیں اور بعض جگہ میں نے اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔ مگر صرف اسی صورت میں جہاں مجھے اپنی رائے کی صحت پر پورا اعتماد تھا۔ زبان اور طرز عبارت کے متعلق صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہوگا کہ میں اہل زبان نہیں ہوں۔ جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا ہے میں نے اقتصادی اصولوں کی حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اردو زبان میں اس قسم طرز عبارت کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی علمی کتابوں میں عام ہے۔ نئی علمی اصطلاحات کے وضع کرنے کے وقت کو ہر باذاق آدمی جانتا ہے میں نے بعض اصطلاحات خود وضع کی ہیں اور بعض مصر کی عربی اخباروں سے لی ہیں جو زمانہ حال کی عربی زبان میں آج کل متداول ہیں۔ جہاں جہاں کسی اردو لفظ کو اپنی طرف سے کوئی نیا مفہوم دیا ہے ساتھ ہی اس کی تصریح بھی کر دی ہے۔ اس کتاب میں ایک آدھ جگہ انگریزی محاورہ کی تقلید میں میں نے اسم ذات کو اسم صفت کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے مثلاً سرمایہ سرمایہ داروں کی معنوں میں یا محنت محنتیوں کے معنوں میں اگرچہ یہ محاورہ اردو پڑھنے والوں کو غیر مانوس معلوم ہوگا تاہم اس کے استعمال میں ایسی سہولت ہے جسکو باذاق لوگ خوب محسوس کر سکتے

ہیں۔ جہاں کئی فارسی محاورات کے لفظی تراجم اُردو زبان میں مستعمل ہیں اگر اس لطیف محاورہ انگریزی کا ترجمہ بھی مستعمل کر لیا جائے تو کیا ہرج ہے۔

اصطلاحات کی نسبت ایک اور عرض یہ ہے کہ میں نے مانگ اور طلب و دستکاری اور محنت دستکار اور محنتی نفع اور منافع۔ ساہوکار اور سرمایہ دار مالک کارخانہ دار مرادف استعمال کئے ہیں۔ پیدائش اور پیداوار کا استعمال ایک باریک فرق کو ظاہر کرتا ہے یعنی پیدائش سے مراد فعل کی ہے اور پیداوار سے مراد نتیجہ فعل کی۔ علےٰ ہذا القیاس لفظِ تبادلہ اُس جگہ استعمال کیا ہے جہاں مبادلہ اشیا از زرِ نقد کے وساطت سے کیا جائے اور لفظِ مبادلہ اُس موقع پر استعمال کیا ہے جہاں ایک شئے دوسری شئے کے عوض میں دی جائے۔ عربی زبان میں مبادلے کا یہ مفہوم لفظ مقائضہ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ مگر چونکہ یہ لفظ عام فہم نہیں ہے اسواسطے میں نے اس کے استعمال سے احتراز کیا ہے۔

اس دیباچے کو ختم کرنے سے پیشتر میں اُستاذی المعظم حضرت قبلہ آرنلڈ صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے اس کتاب کے لکھنے کی تحریک کی اور جنکے فیضانِ صحبت کا نتیجہ یہ اوراق ہیں۔ میں اُستاذی جناب قبلہ لالہ جیارام صاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اور اپنے عزیز دوست اور ہم جماعت مسٹر فضل حسین بی اے کینٹب بیرسٹر ایٹ لا کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے مجھے نہ صرف اپنے بیش قیمت کتب خانوں کی کتابیں ہی عنایت فرمائیں بلکہ بعض مسائل کے متعلق نہایت قابل قدر مشورات بھی دیئے۔ اسکے علاوہ مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولانا شبلی نعمانی مدظلہ بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح دی +

محمد اقبال

حصّۂ اوّل

علم الاقتصاد کی ماہیت اور اُسکا طریق تحقیق

علم الاقتصاد۔ علم انسانی کے اُس خاص حصّے کا نام ہے۔ جسکا موضوع دولت ہے۔ اور جسکا مقصد یہ معلوم کرنا ہے۔ کہ دولت کی پیدائش۔ تقسیم۔ تبادلے اور استعمال کے اُصول و اسباب و طریق کیا کیا ہیں۔ لہذا اِس علم کے طالب کا یہ فرض ہے۔ کہ اپنی تحقیق و تدقیق کو دیگر علوم کی تحقیق سے مخلوط نہ کرے۔ کیونکہ کسی علم کی ترقی اِس امر پر منحصر ہے۔ کہ اُسے دیگر علوم کے سلسلہ سے منفرد سمجھ کر مطالعہ کیا جائے۔ بعض حکمار کی یہ رائے ہے۔ کہ علم اقتصاد وسیع علم تمدن کی ایک جزو ہے۔ اور چونکہ تمدنی زندگی کی عام صورتیں ایک دوسری سے وابستہ ہیں۔ اِسواسطے اِن میں سے کسی ایک کا منفرد مطالعہ کرنا کچھ نتیجہ خیز نہ ہوگا۔ مگر یہ رائے قرین صواب نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ انسانی افعال کا دائرہ اِس قدر وسیع ہے کہ علمی نظر کامل طور سے اُسکا احاطہ نہیں کرسکتی۔ اِسکے علاوہ جیساکہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ کسی علم کے علم بننے کے لئے اُسکی تخصیص ضروری ہے۔

کیا علم الاقتصاد کا مطالعہ دولت کی محبت پیدا کرتا ہے؟ بعض لوگ اس بات پر مصر ہیں۔ کہ اِس علم کا مطالعہ اخلاقی لحاظ سے مفید نہیں ہے کیونکہ اِس سے دولت کی محبت [illegible] ہوتی ہے۔ جو انسان کو تمام اخلاقی [illegible] کیونکہ قابل [illegible]

اور اُسے ایک سنگدل دُنیادار بنادیتی ہے۔ اِس لغو اعتراض کے جواب میں اوّل تو یہ کہ سکتے ہیں۔ کہ اگرچہ انسان کی غرض صرف دولت ہی نہیں ہے۔ تاہم یہ بڑی ضروری اغراض میں سے تو ہے۔ اور اِس وجہ سے لازم ہے۔ کہ اسکا مطالعہ کیا جاوے۔ اور اِس کی پیدائش و تقسیم وغیرہ کے اسباب و طریق معلوم کئے جائیں۔ اِس کے علاوہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ سرے سے یہ اعتراض ہی صحیح نہیں ہے۔ علم الاقتصاد کے مطالعہ سے دولت کی محبت نہیں پیدا ہوتی۔ کیونکہ اسکا مقصد تو صرف یہ معلوم کرنا ہے۔ کہ حصولِ دولت کی خواہش جیسا کہ انسانی فطرت میں موجود ہے۔ انسانی افعال پر کس طرح اثر کرتی ہے۔ ممکن ہے۔ کہ بعض مسلمان طبائع ایسے قوی ہوں۔ کہ حصولِ دولت کی خواہش کو دبائے رکھیں۔ مگر علم اقتصاد کو ان سے تعلق نہیں ہے۔ اِسکا کام یہ نہیں ہے۔ کہ انسان کے چال چلن پر رائے زنی کرے۔ یا یہ فیصلہ کرے۔ کہ کون کون سے محرکات افعال اخلاقی لحاظ سے اچھے ہیں۔ اور کون کون سے بُرے۔ یہ علم انسانی افعال کے وسیع دائرہ کے صرف اِس حصّہ پر غور کرتا ہے۔ جسکا تعلق حصول دولت سے ہے۔ مزید برآں اگر غور کیا جاوے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ علم اقتصاد حرص کی تعلیم نہیں دیتا۔ بلکہ حصولِ دولت کے صحیح اور مسلّم اصولوں پر روشنی ڈالنے سے انسان کو یہ سکھاتا ہے۔ کہ اِس قسم کی خواہش کو ان اصولوں کے تحت میں رکھے اور جنگ و جدل لوٹ مار وغیرہ سے جو اِس زبردست خواہش کا ضروری نتیجہ ہُوا کرتے ہیں۔ احتراز کرکے امن و صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کرے۔

ہم نے لفظ "دولت" کا استعمال کئی جگہ کیا ہے۔ مگر ابھی تک یہ بیان نہیں کیا کہ اُس کی ماہیت اور تعریف کیا ہے۔ دولت میں وہ ممکن الحصول اشیاء شامل ہیں۔ جو بالواسطہ یا بلاواسطہ انسانی ضروریات کو پُورا کریں۔ اور جنکی جائز

اور مناسب طور پر خواہش کی جا سکے - مگر ظاہر ہے - کہ ہر ممکن الحصول شے جسکی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جائے - دولت نہیں ہے (مثلاً ہر شخص یہ خواہش کرتا ہے - کہ اُس کے دوست اُسکے ساتھ محبت کا برتاؤ کریں - مگر یہ محبت دولت نہیں ہے) پس اجزاے دولت کو معلوم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے - کہ پہلے اشیاء مطلوب کو معلوم کیا جائے - مطلوب یا وہ تمام اشیاء جنکی ہر انسان جائز اور مناسب طور پر خواہش کرسکتا ہے - دو قسم کی ہوتی ہیں -

(۱) وہ ممکن الحصول اشیاء مادی جن میں تمام مفید اشیاء اور اُن کے حقوق استعمال شامل ہیں - مثلاً زمین - پانی - آب ہوا - زرعی پیداوار - معدنی پیداوار - مصنوعات - تعمیرات - کلیں - اوزار - رہن نامجات - پٹے وغیرہ -

(۲) اشیاء ممکن الحصول غیر مادی یا ذاتی - اس ضمن میں دو قسم کی اشیاء شامل ہیں -

اوّل تو وہ فوائد جو انسان اوروں سے حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے - مثلاً حقِ خدمتِ ملازمین -

دوئم اس کے ذاتی اوصاف یا قابلیتیں جنکی وجہ سے وہ اپنے کاموں کو سرانجام کرتا ہے - مقدم الذکر کو اشیاء غیر مادی خارجی کہتے ہیں - اور موخر الذکر کو اشیاء غیر مادی اندرونی - اسکے علاوہ اشیاء مطلوب قابلِ انتقال ہوتی ہیں - یا ناقابلِ انتقال - مثلاً انسان کے ذاتی اوصاف یا فطری قوے یعنی اشیاء غیر مادی اندرونی روشنی - ہوا - یا وہ حقوق جو اسکو بہ حیثیت ایک خاص ملک کا باشندہ ہونے کے حاصل ہیں - اشیاء مطلوب کی تقسیم اور طرح سے بھی ہوسکتی ہے - یعنی اشیاء آزاد اور اشیاء قابلِ تبادلہ - اشیاء آزاد سے مراد اُن اشیاء کی ہے - جو نظام قدرت خود بخود مہیا کرتا ہے - اور انسان کو اُن کے حاصل کرنے کے واسطے کوشش

نہیں کرنی پڑتی۔

اشیاء قابلِ تبادلہ میں وہ تمام اشیاء قابل انتقال شامل ہیں۔ جنکی مقدار محدود ہو۔ گر یہ امتیاز عملی لحاظ سے کچھ بڑی وقعت نہیں رکھتا۔

اب اصطلاح "دولت" کا مفہوم بالصراحت واضح ہوجائیگا۔ جب ہم کسی شخص کی نسبت لفظ دولت کا اطلاق کرتے ہیں۔ تو اُسکے معنوں میں دو قسم کی اشیا مطلق شامل سمجھی جاتی ہیں۔

اوّل وہ ممکن الحصول اشیاء مادی وخارجی جن پر اسکو قانوناً یا رواجاً حق ملکیت حاصل ہے۔ اور جو اس وجہ سے قابلِ انتقال و قابلِ تبادلہ ہیں۔

دوم وہ ممکن الحصول اشیاء غیر مادی خارجی جو اسکی ملکیت میں ہوں۔ اور جنکی وساطت سے اشیاء مادی حاصل کیجاسکیں۔ مثلاً کسی شخص کے تجارتی تعلقات وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ "دولت" کے مندرجہ بالا مفہوم میں انسان کے نظری قوا شامل نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ یہ اُس کی ذات سے خارج نہیں ہیں۔ بلکہ اُس کی ذات میں داخل ہیں۔ یا یوں کہو۔ کہ یہ اشیاء غیر مادی اندرونی ہیں۔ جو محاورہ متعارف کے رو سے دولت میں شامل نہیں۔ پس دولت کا پہلا خاصہ یہ ہے۔ کہ ان اشیاء مطلوبہ میں داخل ہو۔ جو ممکن الحصول ہوں۔ اور جنکی خواہش انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے خیال سے جائز اور مناسب طور پر کی جاسکے۔ مگر ظاہر ہے۔ کہ بعض اشیاء ہماری ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ مگر دولت نہیں کہلا سکتیں۔ مثلاً مذاق صحیح۔ خاندانی محبت۔ یا تعلقات وغیرہ لہذا دولت کی کامل تعریف کے لئے کسی اور ایسے خاصہ کا معلوم کرنا ضروری ہے۔ جو اُسکو دیگر اشیاء سے تمیز کرے۔ یہ خاصہ قابلیتِ انتقال یا قدر یا کا زرِ نقد کے بیچنے سے تعین ہوسکتا پس دولت سے مراد اُن خارجی اشیاء کی ہے۔ جنکی جائز اور مناسب طور پر

خواہش کی جا سکے اور جو انسان کی ذاتی ملک ہوں - اور جنکی قدر تبادلے میں زرِ نقد کے پیمانے سے متعین ہو سکتی ہو - یہ پیمانہ ایک طرف تو اس سعی و کوشش کو ظاہر کرتا ہے جس کی وساطت سے یہ اشیاء پیدا ہوئی ہوں اور دوسری طرف ان انسانی ضروریات کو جنکو یہ پورا کرتی ہیں - مختصر طور پر یوں کہ دو - کہ "دولت" میں انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے وہ تمام جائز و مناسب اور ممکن الحصول وسائل داخل ہیں - جو بالفعل یا بالقوۃ قابلِ انتقال ہوں - اِس تعریف سے معلوم ہوتا ہے - کہ صرف وہی شے دولت کہلا سکتی ہے -

(۱) جو کوئی خاص شے ہو - خواہ مادی خارجی ہو - خواہ غیر مادی خارجی -

(۲) جس کی خواہش انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے خیال سے جائز اور مناسب طور پر کی جا سکتی ہو - افریقہ کا ایک وحشی اپنے دشمن کے سر کی خواہش کر سکتا ہے - مگر یہ خواہش اخلاقی لحاظ سے جائز اور مناسب نہیں ہے -

(۳) جو ممکن الحصول ہو -

(۴) جس پر انسان کو حق ملکیت حاصل ہو -

(۵) جس میں قابلیتِ انتقال ہو - یا یوں کہو - کہ جس کی قدر تبادلے میں زرِ نقد کے پیمانے سے متعین ہو سکتی ہو -

دولتؔ کی مندرجہ بالا تعریف میں ہم نے لفظ "قدر" کو استعمال کیا ہے - جو علم اقتصاد کی ایک ضروری اصطلاح ہے - دولت کی تعریف کما حقہ سمجھنے کے لئے

سلہ فلسفہ تمدن کا فرض منصبی یہ ہے - کہ انسانی زندگی کا اعلےٰ ترین مقصد معلوم کرے - لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف وسائل اور قابلِ عمل طریق معلوم کرنا اِس علم کا کام نہیں ہے - بلکہ یہ کام علم الاقتصاد - فنِ تعلیم اور علمِ تدبیرِ مملکت کا ہے - تحقیقاتِ تمدنی سے معلوم ہوتا ہے - کہ انسانی تمدنی ترقی کے لئے تین ضروری شرائط ہیں -

یہ ضروری ہے کہ اس اِصطلاح کا مفہوم ذہن نشین ہو۔ فرض کرو کہ میرے پاس ایک گھڑی ہے۔ میں اُسے بیچ کر اپنی ضروریات پُورا کرتے یا اوروں سے خدمت لینے کی قدرت رکھتا ہُوں۔ یہ قدرت مجھے کہاں سے حاصل ہوئی؟ صرف اُس گھڑی کے وساطت سے۔ اگر یہ شے میرے پاس نہ ہوتی۔ تو مجھ میں یہ قدرت بھی نہ ہوتی۔ پس "قدر" اس قدرت یا قوت کا نام ہے جو کسی شے کی وساطت سے اُس شے کے قابض کو حاصل ہوتی ہے۔ اور جس کو تبادلے میں دیگر وہ شخص بلا لحاظ جبر واکراہ یا تاثرات ذاتی۔ اور وں کی پیداوار محنت کو حاصل کر سکتا ہے۔ مختصر طور پر یوں کہو۔ کہ قدر قوت تبادلہ کا نام ہے۔ اس تعریف کے الفاظ پر غور کرو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲) (۱) نظام قدرت کے قوائے مخفیہ کو معلوم کرنا۔ اور اُن سے مستفید ہونا۔ مثلاً زمانۂ حال میں برقی قوت سے جو نظام قدرت کے قوائے میں سے ہے۔ انسان بے انتہا فائدہ اُٹھاتا ہے۔

(۲) تمدنی تعلقات کی تکمیل۔ مثلاً میاں بی بی کا رشتہ بعض اقوام کے نزدیک ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔ بعض اسکو ایک معمولی معاہدہ سمجھتے ہیں۔ انسانی تمدن کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ کہ تمام تمدنی تعلقات کے صحیح مفہوم معلوم کرکے اُن کے مطابق عملدرآمد کیا جائے۔

(۳) افراد کے ذاتی قوائے کی ترقی۔ مثلاً تعلیم و تربیت وغیرہ۔ نمبر ۲ و ۳ کی تحقیقات اور بحث علم تدابیر مملکت اور فنِ تعلیم سے متعلق ہے۔ مگر چونکہ نمبر ۱۔ کی تحقیق علم الاقتصاد کا فرض ہے۔ اسواسطے اس ضمن میں چند سطور لکھنا ضروری ہے۔ بعض لوگوں کی رائے میں نظام قدرت کے مخفی قوائے کے معلوم کرنے سے انسانی زندگی میں ایک قسم کا تصنع اور بناوٹ آجانے کا اندیشہ ہے جو اسکی فطرتِ صحیحہ کے مخالف ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ انسان فطرتاً ایک ایسی ہستی ہے۔ جو اپنی زندگی کا ایک خاص مقصد مقرر کرتی ہے۔ اور پھر اُسی کے اعتبار سے اپنے عمل کو متعین کرتی ہے۔ پس اس لحاظ سے ہر کام انسانی زندگی میں تصنع کا آنا ضروری بلکہ لازمی ہے۔ ... کے

ہم نے کہا ہے - بلا جبر و اکراہ - یا تاثراتِ ذاتی - کوئی مطلق انسان بادشاہ اپنی رعایا کو جہاں چاہے لڑنے مرنے کے لئے بھیج سکتا ہے - مگر یہ خدمات علم اقتصاد کے دائرہ میں نہ آئینگی - کیونکہ اُن کی بنا جبر و اکراہ پر ہے - برخلاف اسکے انگریزی سپاہی کی خدمات دائرہ علم اقتصاد میں داخل ہیں - کیونکہ وہ اپنی مرضی سے ایک خاص تنخواہ کے عوض فوجی خدمت قبول کرتا ہے - اسی طرح اس ماں کی خدمات بھی دائرۂ علمِ اقتصاد سے خارج ہیں - جو اپنے بیمار بچے کی حفاظت میں بعض دفعہ جان بھی دیدیتی ہے - کیونکہ اُسکی بنا ذاتی تاثرات یا محبت پر ہے -

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۳ -) عمرانی اصول سے ہمیں یہ فائدہ اُٹھانا چاہئے - کہ نظامِ قدرت کے اُن مخفی قواے کو معلوم کریں جو حقیقۃً ہمارے لئے مفید ہیں - مثلاً لفظ "دولت" کا اصلی مفہوم معلوم کرنا - اور اُن اسباب کو معلوم کرنا جن کی وساطت سے دولت پیدا ہوتی ہے" - تاریخ علم الاقتصاد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کے مفہوم میں کئی تغیر آئے ہیں - اور یہ ضروری نہیں کہ موجودہ مفہوم صحیح اور آخری ہو - جس میں اب کوئی تغیر آنیکا امکان نہیں ہے - ایک زمانہ میں سمجھا جاتا تھا - کہ دولت اور زرِ نقد مرادف الفاظ ہیں - اس غلط مفہوم سے ایک ایسا مغالطہ پیدا ہوا - جسکو نظامِ تجارت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے - مختلف ممالک کے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ دیگر ممالک سے اشیاء کا خریدنا گویا اپنے ملک سے زرِ نقد کا باہر نکالنا ہے - اس خیال سے حتی المقدور اپنی اشیاء فروخت کرتے تھے - اور دیگر ممالک کی اشیاء پر بقدر محصول لگادیتے تھے - کہ وہ ملک میں بکنے ہی نہ پاویں - اس مغالطہ کو پہلے ایڈم سمتھ صاحب نے ظاہر کیا اور دولت کی تعریف اس طرح پر کی - کہ یہ اُن مادی اشیاء کا مجموعہ ہے - جو انسان کے لئے مفید ہیں - جب تک یہ خیال قائم رہیگا - دولت ایک قسم کی مادی شے تصور کیجاویگی اور ان اشیاء کے برخلاف ایک قسم کا تعصب پیدا ہوتا جائیگا - جو انسانی حاجات کو رفع تو کرتی ہیں - لیکن مادی النظر میں ہمارے وسائل زندگی کو زیادہ نہیں کرتیں - مثلاً بڑے بڑے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴-) مناعوں کی کھینچی ہوئی تصویریں۔ آخر یہ تعریف بھی مقبول نہ ہوئی اور محققین علم اقتصاد کو بتدریج یہ محسوس ہوتا گیا۔ کہ اشیاء کی مختلف اقسام کی قدر انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لحاظ سے مختلف حالات میں مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے مندرجہ بالا تعریف میں اشیاء کی جگہ "مفیدات" کا لفظ استعمال کرنا شروع کیا۔ اور دولت کی تعریف اس طرح پر کی۔ کہ یہ اُن مفیدات کا مجموعہ ہے۔ جو انسانی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن یہ تعریف بھی مشکلات سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ لفظ ضرورت کا مفہوم مشکوک ہے۔ ممکن ہے کہ جس شے کو ہم اپنی ضرورت سمجھے ہوئے ہیں۔ حقیقت میں ہماری ضرورت نہ ہو۔ اگر ہماری ظاہری ضروریات ہمیں بربادی کی طرف لے جائیں۔ تو اُن ضروریات کو پورا کرنے کے اسباب ہرگز دولت نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ لہٰذا دولت کا اصل مفہوم معلوم کرنے سے پیشتر ہمیں اپنی حقیقی اور ظاہری ضروریات کے درمیان امتیاز کرنا ضروری ہے۔ یہاں ایک اور مشکل پیش آتی ہے۔

انسان کی حقیقی ضروریات اُس کی ظاہری ضروریات سے متمیز نہیں ہو سکتیں۔ جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو۔ کہ انسان کی حقیقی بہبودی کیا ہے۔ اس کے علاوہ تہذیب و تمدن کے مختلف مدارج اور حالات میں دولت کی مختلف اقسام کی وقعت مختلف ہوتی ہے۔ اور اُن کی قدر صرف اُن ضروریات کے لحاظ سے ہی متعین نہیں ہوتی۔ جنکو وہ پورا کرتی ہیں۔ بلکہ اس بات پر بھی منحصر ہوتی ہے کہ انسان اُنکو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ تعلیم و تربیت کا اثر بالعموم ہماری نگاہ میں ایک قسم کا تغیر پیدا کر دیتا ہے۔ اور بسا اوقات ہم اُن اشیاء کو دولت نہیں سمجھتے جنکو تعلیم پانے سے پہلے دولت تصور کیا کرتے تھے۔ غرض عملی طور پر مفید ہونے کے لئے علم الاقتصاد کے لئے ضروری ہے۔ کہ اِن تمام علوم کی تحقیقات سے فائدہ اُٹھائے۔ جنکا مدعا انسانی زندگی کا فلسفہ [illegible] مقصد اُس کی حقیقی بہبودی اور اُس کی تہذیب و تمدن کے مختلف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵) مدارج معلوم کرتا ہے۔ موجودہ حالات میں جہاں تک ہمیں ان امور کا علم حاصل ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ضروریاتِ زندگی دو قسم کی ہوتی ہیں۔

اوّل وہ اشیاء جو قیامِ زندگی کے لئے ضروری ہیں۔

دوم وہ اشیاء جو خاص خاص حالات اور تمدنی حیثیات کے لحاظ سے ضروری ہیں مثلاً گاڑی گھوڑا رکھنا بعض حالات میں محض فضول خرچی ہے۔ لیکن بعض حالات میں ضروریات سے ہے۔ اگر مطلوب شے کو جو ان ہر دو اقسام میں نہیں آتی۔ اسبابِ تعیش وتنعم یا تن آسانی میں داخل سمجھا جاوے تو ظاہر ہے۔ کہ اسبابِ تعیش میں مندرجہ ذیل اشیاء شامل ہونگی۔

(۱) وہ تمام اشیاء جو ان اشیاء سے مشابہ تر ہیں۔ جو اوپر کی ہر دو اقسام میں آتی ہیں تاہم معمولی حالات میں نہ ضروریاتِ زندگی میں سے ہیں۔ نہ اُن اشیاء میں سے ہیں۔ جو خاص خاص حالات اور تمدنی حیثیات میں ضروری ہیں۔

(۲) وہ تمام اشیاء جو بالعموم مطلوب تصور کی جاتی ہیں۔ مگر انسان کی بہبودی کے لئے ضروری نہیں ہیں۔

(۳) وہ اشیاء جن سے ایک قسم کی عارضی لذت حاصل ہوتی ہے۔ تاہم انسانی بہبودی پر اُن کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

(۴) وہ اشیاء جو بالواسطہ یا بلاواسطہ انسانی زندگی کو ایک اعلےٰ مقام تک رسائی حاصل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ مثلاً کتابیں۔ اور فنِ مصوری کے کرشمے۔ پہلی قسم کی قدر کافی طور پر واضح ہے۔ کیونکہ انسان اپنے کاروبار میں فطرتاً کسی قدر آسائش کو بھی چاہتا ہے۔ دوسری اور تیسری قسم کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ خصوصاً جبکہ ان اقسام کی اشیاء کا حاصل کرنا ان اشیاء کے حصول سے متناقض ہو جو اعلےٰ تر وقعت رکھتی ہیں۔ ہاں چوتھی قسم کی اشیاء غیر ضروری ہیں۔ ان میں سے بعض مثلاً کتابیں وغیرہ انسانی ترقی کے لئے اس قدر

اِس تعریف کو مختصر طور پر بیان کرتے ہوئے ہم نے کہا ہے۔ کہ "قدر" قوت تبادلہ کا نام ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قدر کے تعین کے لئے تبادلہ ضروری ہے۔ مگر تبادلے کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ کوئی اور فرد بھی ہو جسکے ساتھ تبادلۂ اشیاء کیا جاوے۔ اب اس تعریف کے لحاظ سے دیکھو۔ کہ آیا عقل، ہنر اور فطری قواے جنکو انسان کے ذاتی اوصاف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ قدر رکھتے ہیں! یہ تو ظاہر ہے۔ کہ یہ اشیاء ناقابل انتقال ہیں۔ یا بالفاظ دیگر انکا تبادلہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ انسان کی ذات سے منفک نہیں ہو سکتے۔ بعض حکماء کا قول ہے۔ کہ چونکہ قدر کے لئے اشیاء میں قابلیت انتقال کا ہونا ضروری ہے۔ بسوا ذاتی اوصاف قدر سے مبرا ہیں۔ اور دولت میں شامل نہیں ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگرچہ انسان کے ذاتی اوصاف یا فطری قواے میں قابلیتِ انتقال نہیں ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) ضروری ہیں۔ کہ بعض انسان ان کے لئے اصل ضروریات زندگی کو ترک کرنا گوارا کرینگے۔ مگر اِن اشیاء کو تیسری قسم کی اشیاء سے تمیز کرنا ذرا مشکل ہے۔ بعض اشیاء جن سے عارضی لذت حاصل ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کو تازگی اور شگفتگی بخشنے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف یہ بھی سچ ہے۔ کہ بعض پُرانی مہذب قوموں کی بربادی عارضی لذات کی جستجو اور اُن اشیاء سے بے پرواہ رہنے کی وجہ سے ہوئی۔ جن سے انسانی زندگی کو حقیقی سوت اور رجلا حاصل ہوتا ہے۔ زمانۂ حال کی تہذیب اُسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے۔ کہ لذیذ اور مفید میں امتیاز کیا جائے۔ اور اُس امتیاز کو ملحوظ خاطر رکھ کر اپنے افعال و اعمال کو مرتب کیا جائے۔ تاکہ ہمیں اپنی زندگی کی اصل غرض یعنی بہبودی بنی نوع انسان کے حصول میں آسانی ہو۔

تاہم اُن کے استعمال میں یہ قابلیت موجود ہے۔ ہم اپنے فطری قواے کو کسی اور شخص کی خاطر استعمال کر کے اُس سے حق الخدمت حاصل کر سکتے ہیں۔ بڑھئی کا ہنر نہ صرف اوروں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ بلکہ بالواسطہ اسکی اپنی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے بھی ایسا ہی لازمی ہے۔ جیساکہ اُس کے اوزار وغیرہ۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بعض محققین نے محاورہ متعارف کے رُو سے اگرچہ لفظ "دولت" کا اطلاق اشیاء خارجی پر کیا ہے۔ تاہم انسان کے فطری قواے کو اسکی ذاتی دولت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اِس راے کے لحاظ سے کسی ملک کے لوگوں کا ہنر۔ دیانت داری وغیرہ بھی اس ملک کی دولت میں شامل ہیں۔ مگر بعض اہل الراے نے بغیر کسی امتیاز کے ذاتی دولت کو بھی دولت متعارف میں داخل سمجھا ہے۔ اِن کے نزدیک دولت میں تین قسم کی اشیاء داخل ہیں۔

(۱) وہ ممکن الحصول اشیاء مادی خارجی جنکی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جا سکے۔ اور جن پر انسان کو قانونًا یا رواجًا حقِ ملکیت حاصل ہو۔

(۲) وہ ممکن الحصول اشیاء غیر مادی خارجی جن کی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جا سکے۔ اور جو اُس کی ملکیت میں ہوں۔ اور جن کی وساطت سے اشیاء مادی حاصل کی جا سکیں۔ مثلاً حقوقِ خدمت ملازمین۔ اور تجارتی تعلقات وغیرہ۔

(۳) وہ ممکن الحصول اشیاء غیر مادی اندرونی جنکی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جا سکے یعنی انسان کے فطری قواے۔ ہمارے نزدیک پہلی راے زیادہ قرینِ صواب معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ دونوں میں صرف ایک لفظی فرق ہے معنوی فرق کوئی نہیں۔ قدر کے بیان سے یہ بات

بھی سمجھ میں آگئی ہوگی۔ کہ دولت اور بہبودی مرادف الفاظ نہیں ہیں۔ اکثر اشیاء ہماری بہبودی کے لئے ضروری ہیں۔ تاہم دولت کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں۔ مثلاً اگر آزاد دستکاروں کو غلام تصور کیا جائے۔ تو اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ دولت کی مقدار میں اضافہ ہوگا۔ مگر انسان کی بہبودی کے لئے یہ امر مضرت رساں ہوگا۔ اسی طرح دولت کی مقدار بعض دفعہ کچھ عرصہ کے لئے ایسے اسباب فراہم ہو جاتے ہیں۔ جو ملکی ترقی کے ممد ہوں۔ مثلاً کلوں کی ایجاد سے چھوٹے چھوٹے اوزار استعمال کے دائرہ سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ملکی ترقی کا انحصار بہت کچھ اس قسم کی ایجادات پر ہے۔ پس معلوم ہوا۔ کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ دولت کی مقدار دن بدن کم ہونے کی طرف میلان رکھتی ہے۔ اگر آبادی بڑھتی نہ جاتی۔ اور انسانی ضروریات و حاجات کا دائرہ دن بدن وسیع نہ ہوتا جاتا تو علم الاقتصاد کے موضوعات کا احاطہ بھی تنگ ہوتا جاتا۔ یہاں تک کہ اس علم کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

اس ضمن میں یہ واضح کر دینا بھی لازم معلوم ہوتا ہے۔ کہ "دولت" اور "جائداد" بھی ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ کیونکہ اس امتیاز کا علم محصول مالگذاری کی بحث میں کام آئیگا۔ فرض کرو کہ ایک قطعہ زمین ایک شخص کے لئے تو دولت ہوگی۔ جو اسکا لگان وصول کرتا ہے۔ اور جو اپنے قرض کی عدم ادائگی کی صورت میں اسے بیچ کر اپنی رقم وصول کر سکتا ہے۔ مگر ملک کے لئے یہ زمین دولت نہ ہوگی۔ کیونکہ اگر فک الرہن ہو جائے۔ تو ملک کی دولت میں کوئی تغیر نہ ہوگا۔ اس امتیاز کو زیادہ وضاحت سے یوں بیان کر سکتے ہیں۔ کہ زمین مذکور تو دولت ہے۔ کیونکہ ایک خاص معین قدر رکھتی ہے مگر رہن دولت نہیں۔ بلکہ جائداد یا دولت کی ایک خاص [illegible] ادا کر [illegible] سکے

یا استعمال میں لاسکنے کا حق ہے۔ جو مرتہن کو حاصل ہے۔ یعنی مالکِ زمین کی جائداد کی مقدار اس زمین کی قدر منفی حقِ مرتہن کے برابر ہے۔ اس مثال میں دولت تو ایک ہی ہے۔ مگر جائدادیں دو ہیں۔ ایک تو اصل مالک کی جائداد۔ دوسری مرتہن کی۔ زمین کی ملکیت خواہ ایک شخص خواہ کئی جائدادوں پر منقسم ہو ملک کی دولت میں کوئی تغیر واقع نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ علم الاقتصاد کو لفظِ جائداد کو سروکار نہیں ہے۔ کیونکہ اس لفظ کا مفہوم اقتصادی نہیں۔ بلکہ قانونی ہے۔

علم الاقتصاد کی ماہیت کو واضح کرنے کے لئے اصطلاحات "دولت" "قدر" کے معانی کا بالصراحت بیان کرنا ضروری تھا۔ اسواسطے مندرجہ بالا سطور ہمکو لکھنی پڑیں۔ اب ہم پھر اصل مضمون کی طرف عود کرتے ہیں۔ اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کہ علم الاقتصاد کے اصول ابتدائی کیا کیا ہیں۔ اس ضمن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ اصول اولیہ اور واقعات کیا ہیں۔ جنکی بناء پر علم الاقتصاد کا ماہر اپنے استدلال کو قائم کرتا ہے؟ کیا اس استدلال میں ان تمام واقعات کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ جو دولت پر اثر کرتے ہیں۔ یا صرف چند ضروری واقعات پر قناعت کرنی چاہئے؟ کیا نتائج کلیہ پر پہونچنے کے لئے انسان کی حقیقی فطرت کا مطالعہ لازم ہے؟ یا اس غرض کے لئے ہمیں ایک خیالی انسانی فطرت کا تصور کرنا چاہئے۔ جسکا ہر فعل اوروں کے لئے نمونہ ہو؟ کیا مختلف ممالک کے حالات زمین و آب و ہوا و زرعی قابلیت اور لوگوں کے عادات اور اُن کے اوضاع و اطوار کا معلوم کرنا ضروری ہے۔ یا صرف انہیں حالات و اوصاف کا علم ضروری ہے۔ جو بالاشتراک ہر قوم میں پائے جاتے ہیں۔؟ ان سوالوں کے جواب پر علم اقتصاد کی ماہیت اور اسکا طریق تحقیق منحصر ہے۔ مگر اس بارہ میں حکما کے درمیان بڑا اختلاف رائے ہے۔

بعض کے نزدیک اس علم کے ابتدائی اصول صرف چند واقعات ہیں۔ جنکا تعلق انسانی فطرت انسانی تمدن اور کرۂ ارض کی طبعی بناوٹ کے ساتھ ہے۔ اور بعض کے نزدیک علم الاقتصاد کے ماہر کا یہ فرض منصبی ہے۔ کہ انسانی فطرت کے کسی ایسے واقعہ کو نظر انداز نہ کرے۔ جسکا تعلق دولت یا دولت کی تقسیم اور پیدائش کے ساتھ ہو۔ لہٰذا اُن حکماء کی رائے میں جُوں جُوں انسانی فطرت کا علم وسیع ہوتا جاتا ہے۔ تُوں تُوں علم الاقتصاد بھی وسعت حاصل کرتا جاتا ہے ایک محقق جو اِن حکماء کے طبقۂ متاخر الذکر میں داخل ہے۔ کہتا ہے کہ ماہرین علم الاقتصاد کے فرائض مندرجۂ ذیل ہیں۔

(۱) اِن بڑے بڑے اصولوں کا معلوم کرنا جو حصولِ دولت پر اثر کرتے ہیں۔

(۲) اِنسان کی دماغی بناوٹ کے بعض ضروری واقعات کا معلوم کرنا جنکا تعلق انسانی فطرت کے ساتھ ہے۔

(۳) پیدائشِ دولت کے قدرتی اسباب کے بڑے بڑے طبعی خواص معلوم کرنا۔

(۴) دیگر اسباب کا تحقیق کرنا جو انسانی افعال پر اثر کرتے ہیں۔ جنکا مقصود حصولِ دولت ہو۔ مثلاً ملکی اور تمدنی رسوم۔ جدید ضروریات کا پیدا ہونا۔ یا قوانینِ متعلقۂ زمین وغیرہ مگر ہماری رائے میں دونوں فریق راستی پر ہیں۔ علم الاقتصاد کے لئے ضروری ہے۔ کہ اول چند خاص اصول بطور بناء کے قائم کئے جاویں۔ اور پھر یہ معلوم کیا جائے۔ کہ انسانی زندگی کے موجودہ حالات و واقعات سے اِن ابتدائی اصولوں میں عملاً کیا تغیر پیدا ہوتا ہے۔ بہرحال علاوہ اور باتوں کے ماہرین علم الاقتصاد کے لئے یہ نہایت ضروری ہے۔ کہ اپنے علم کی بنیاد

انسانی فطرت کے صحیح اصولوں پر قائم کریں۔ ورنہ اُن کو صحیح اور مکمل نتائج کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ فرضاً اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے۔ کہ انسان بالطبع خودغرض ہے۔ یا اسکی فطرت قدرتاً وصفِ ایثار سے کلی طور پر معرا ہے۔ اور اس ابتدائی اصول کو اقتصادی استدلال کی بنیاد قرار دیا جائے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ تمام استدلالات جو اس اصول پر مبنی سمجھے جائینگے۔ غلط ہونگے۔ کیونکہ حقیقتاً انسانی فطرت اس قسم کی نہیں ہے۔ بلکہ خودغرضی اور ایثار دونوں سے مرکب ہے۔ اگر کسی قوم میں علم الاقتصاد کے ایسے اصول مروّج ہو جائیں جو اس قسم کے غلط منشاء پر مبنی ہوں۔ تو وہ قوم ایک دو صدیوں کے عرصہ میں ہی ایک حیرت ناک اخلاقی تنزل کریگی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قوم کے ہر فعل میں بے جا خودغرضی اور زرپرستی کی بو آئیگی۔ جو اُسکو کسی نہ کسی دن حضیضِ ذلت میں گرا کر چھوڑیگی۔ لہذا بعض مصنفین نے فطرتِ انسانی اور دیگر حالاتِ طبعیہ کو ملحوظ رکھکر علم الاقتصاد کے لئے چند ابتدائی مفروضات یا اصول متعارفہ قائم کئے ہیں۔ جن پر تمام استدلالاتِ اقتصادیہ مبنی ہیں۔ ان میں سے بڑے بڑے اصول مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) بالعموم ہر انسان کم و بیش دولت کی خواہش رکھتا ہے۔

(۲) سرمایہ دار اور محنتی قدرتاً ان مشاغل کو ترک کر دیتے ہیں۔ جن میں نفع یا اجرت کم ہو۔ اور ایسے مشاغل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جن میں منافع یا اجرت زیادہ ہو۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے۔ کہ یہ ابتدائی اصول اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے۔ جب کہ ملک میں ہر طرح سے امن ہو۔ غلامی کا دستور نہ ہو۔ اور وہ تمام اسباب معدوم ہوں۔ جو سرمایہ داروں اور محنتیوں کو تجارت کی ایک شاخ سے دوسری شاخ میں منتقل ہونے سے روکتے ہوں۔ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ اب سے ایک صدی پہلے ہندوستان میں یہ بات

بہت مشکل تھی - کہ کوئی شخص ایک شہر سے دوسرے شہر میں جاکر کاروبار کرے -

(۳) زمین کمیت یا مقدار میں محدود ہے - لیکن کیفیت یا خواص میں بالعموم ایک ملک کی زمین دوسرے ملک کی زمین سے مختلف ہوتی ہے -

(۴) دنیا کی زمین بالعموم اس قدر زرخیز ہے - کہ معمولی علم و ہنر کے کاشتکار کا حاصل محنت اس مقدار سے زیادہ ہوتا ہے - جو صرف اس کے ذاتی گذارے کے لئے کافی ہو -

مندرجہ بالا سطور سے واضح ہو گیا ہو گا - کہ علم الاقتصاد منفرد واقعات کے مطالعہ سے قوانین کلیہ بھی قائم کرتا ہے - اور اپنے ابتدائی مسلمہ اصولوں سے نتائج بھی پیدا کرتا ہے - جنکی صحت یا عدم صحت واقعات کے ساتھ مقابلہ کرنے سے معلوم کی جاتی ہے - یا بالفاظ اصطلاحی یوں کہو - کہ یہ علم دیگر علوم کی طرح عمل استقرا، اور عمل استخراج دونوں کے استعمال سے مستفید ہوتا ہے - اس مقام پر یہ یاد رکھنا ضروری ہے - کہ تمام کلیہ قوانین واقعات پر مبنی ہوتے ہیں - اور اس لحاظ سے انکا عمل محدود ہوتا ہے - مگر علم الاقتصاد کے قوانین کلیہ خصوصیت کے ساتھ محدود ہیں - کیونکہ مختلف ممالک و اقوام کے اقتصادی اور تمدنی حالات و واقعات بعض صورتوں میں کم و بیش مختلف ہیں - مثلاً اس علم کے بعض قوانین مغرب کے ممالک کی نسبت تو صحیح ہیں - مگر ہندوستان کی صورت میں اختلاف حالات کی وجہ سے صحیح نہیں ہیں - یہی وجہ ہے - کہ بعض حکماء علم الاقتصاد کو ریاضی اور دیگر علوم کا ہمپایہ تصور نہیں کرتے - اور اسکو اقوام اور ممالک کے ساتھ مختص سمجھتے ہیں - ایک مصنف نے حال ہی میں ایک کتاب لکھی ہے - جسکو

اُس نے "اقتصادِ ہندی" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ مگر ہماری رائے میں یہ غلطی علم کو فن سے متمیز نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ علم کا کام صرف واقعات کے علل و اسباب معلوم کرنا ہے۔ یہ کسی طریقِ عمل پر مستحسن یا مذموم ہونے کا حکم نہیں لگاتا۔ برخلاف فن کے کہ اسکا فرض منصبی خاص واقعات کو ملحوظ رکھ کے کسی مقصد کے حصول کے لئے خاص خاص قواعد اور طریقِ عمل پیش کرنا ہے۔ ہماری رائے میں علم اقتصاد کا یہ کام نہیں۔ کہ کسی ملک یا قوم کے لئے کوئی خاص طریقِ عمل پیش کرے۔ یا کسی طریق پر حکم لگائے۔ لہٰذا ہم اس کو دیگر نظری علوم کی طرح ایک علم سمجھتے ہیں۔ اگرچہ یہ تسلیم کرنے میں ہمیں عذر نہیں ہے۔ کہ اس کے کلیہ اصولوں میں جدید واقعات کے لحاظ سے ایسا تغیر آنا ممکن ہے۔ جس سے اُن کی وسعت زیادہ ہو جائے۔ اور اُن کو نئے نئے واقعات پر حاوی کر دے۔

علم الاقتصاد کا تعلق دیگر علوم سے — علم الاقتصاد اپنی تحقیق میں دیگر علوم سے بہت مدد لیتا ہے۔ مثلاً علم الابدان سے۔ اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ بقائے زندگی کے لئے ایک معین خوراک کی ضرورت ہے۔ یا انسان کے شہوانی قوائے آبادی کو زیادہ کرنے کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ ان ہر دو مسلمات سے مسئلۂ اُجرت و آبادیٔ انسان کی بحث پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس علم کیمیا سے اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی قابلیت پیداوار کی ایک خاص حد ہے۔ جسکو لگان کی بحث میں ملحوظ رکھنا چاہئے۔ مگر یاد رہے کہ اگرچہ اس علم کے محقق کو دیگر علوم کی تحقیقات سے مدد لینی چاہئے۔ تاہم یہ بھی لازم ہے۔ کہ وہ علم اقتصاد کی ذیلی حدود کو مد نظر رکھے۔ اور اِن بحثوں میں نہ پڑ جائے۔ جنکا تعلق دولت کی تقسیم و تبادلہ وغیرہ سے

نہیں ہے۔

علم الاقتصاد اور علم اخلاق ۔ اگرچہ علم الاقتصاد دیگر علوم میں سے بعض کے ساتھ ایک ضروری تعلق رکھتا ہے ۔ مگر علم اخلاق کے ساتھ اسکا تعلق بہت گہرا ہے ۔ اِس علم کی طرح علم اخلاق کا موضوع بھی وہی اشیاء ہیں ۔ جو بعض انسانی مقاصد کے حصول سے وابستہ ہیں ۔ فرق صرف اس قدر ہے ۔ کہ علم اخلاق کا موضوع وہ افعال ہیں ۔ جو زندگی کے افضل ترین مقصد کے حصول کی شرائط ہیں ۔ اور علم الاقتصاد کا موضوع وہ اشیاء ہیں ۔ جو انسان کو معمولی مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ہیں ۔ اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے ۔ کہ انسان کے معمولی مقاصد کی پوری قدر سمجھنے کے لئے ان پر اخلاقی مقاصد کے لحاظ سے نگاہ ڈالنی چاہئے ۔ مثلاً خوراک ۔ لباس ۔ مکان ۔ ہماری زندگی کے لئے ضروری ہیں ۔ اور ان کی قدر ان مقاصد کی قدر پر منحصر ہے ۔ جنکو یہ پورا کرتے ہیں ۔ مگر زندگی کے ان معمولی مقاصد کی اصلی وقعت صرف اس صورت میں معلوم ہو سکتی ہے ۔ جب ہم ان پر زندگی کے افضل ترین مقصد کے لحاظ کر غور کریں ۔ اِس لئے علم الاقتصاد کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے کسی قدر مطالعہ علم اخلاق کا بھی ضروری ہے ۔ اکثر مصنفین نے اِس صداقت کو محسوس نہیں کیا ۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا ۔ کہ دولت بلالحاظ زندگی کے افضل ترین مقصد کے بجائے خود ایک مقصد تصور کی گئی ۔ جس سے بعض تمدنی بھلائیوں کے ظہور پذیر ہونے میں بے جا تعویق ہوئی ۔ اور دولت کے پیار کرنے والوں کی حرص و آز پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی ۔

علم الاقتصاد کا تعلق علم تمدن سے ۔ علم تمدن وہ علم ہے ۔ جو انسانی زندگی کے افضل ترین مقصد اور اس کے حصول کے طریق معلوم کرتا ہے ۔

اِس علم کا دائرہ اِس قدر وسیع ہے۔ کہ تمام دیگر علوم اِس کی تحقیقات سے متاثر ہوتے ہیں۔ کیونکہ بلاواسطہ یا بالواسطہ تمام علوم کا موضوع ذاتِ اِنسان ہے۔ جو خصوصیت کے ساتھ علم تمدن کا موضوع ہے۔ کسی شے کی حقیقی قدر و منزلت اِس امر پر منحصر ہے۔ کہ وہ کہاں تک ہماری زندگی کے اعلےٰ ترین مقصد کے حصول میں ہم کو مدد دیتی ہے۔ یا یوں کہو۔ کہ ہر شے کی اصلی وقعت کا فیصلہ تمدنی لحاظ سے ہوتا ہے۔ دولت ہی کو لے لو۔ اگر یہ شے ہمارے افضل ترین مقاصد کے حصول میں ہماری مدد نہیں دے سکتی۔ تو پھر اِس کا کیا فائدہ؟ لہٰذا علمِ اقتصاد جس کا موضوع دولت ہے۔ وسیع علم تمدن پر مبنی ہے۔ جس کا منشا ہر شے کی اصلی وقعت کا فیصلہ کرنا ہے۔ اِنسان کی زندگی کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔ اور یہ تمام اشیاء دولت صحت اور فرائض کی انجام دہی وغیرہ اِس مقصد کے حصول کے مختلف ذرایع ہیں۔ چونکہ علمِ تمدن کا منشا ہمارے اعلےٰ ترین مقصد کی حقیقت کا معلوم کرنا ہے۔ اور ہماری روزمرہ کی ضرورت کی چیزوں کی حقیقی قدر اِس علم کے لحاظ سے فیصلہ پاتی ہے۔ اِسواسطے علمِ اقتصاد اور دیگر انسانی علوم علم تمدن سے ایک نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ ایک معنوں میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ اِس پر مبنی ہیں۔

علم الاقتصاد کے مختلف حصص۔ علم الاقتصاد کی ماہیت اور اُسکا طریق تحقیق بیان کر چکنے کے بعد اب ہم اِس علم کے چار بڑے حصص بیان کرتے ہیں۔ جو تمام اقتصادی مسائل پر حاوی ہیں۔

(۱) دولت کی پیدائش۔

(۲) دولت کا تبادلہ۔

(۳) دولت کی تقسیم۔

(۴) دولت کا صرف یا استعمال۔

اِس کتاب کے آیندہ حصص میں علی الترتیب اِن کا ذکر ہوگا۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ علم الاقتصاد کے حصص کی مندرجہ بالا تقسیم ہم نے منطقی وضاحت کی غرض سے کی ہے۔ ورنہ جیسا کہ تمہیں آگے چلکر معلوم ہوگا۔ یہ سب حصص آپس میں ایک گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً اشیاء کے صرف یا استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ کونسی اشیاء ملک میں تیار کی جانی چاہئیں۔ اِسی طرح پیدائش دولت کی کیفیت اور کمیت اُس کی تقسیم سے متاثر ہوتی ہے۔ اور اگر انقسام محنت کا اصول پورے طور پر مروج ہو جائے۔ تو پیدائش دولت سے تبادلہ لازم آتا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس دولت کی تقسیم تبادلے سے متاثر ہوتی ہے۔

حصۂ دوم

{پیدائشِ دولت}

بابِ اوّل

(زمین)

جب ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ انسان دولت پیدا کرتا ہے۔ تو ہمارا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ انسان کسی شے کا خالق ہے۔ یا اُسے عدم سے وجود میں لاتا ہے دولت پیدا کرنے سے مراد محنت اور سرمائے کی مدد سے اشیاء میں صرف ایک خاص قدر کا پیدا کرنا ہے۔ جو اپنی اصلیت کے لحاظ سے مندرجہ ذیل اقسام میں منقسم کی گئی ہے۔

(ا) قدر مختص بالمکان یعنی وہ قدر جو کسی شے کو ایک مقام سے جہاں وہ پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے مقامات میں جہاں اسکی ضرورت ہے۔ منتقل کرنے سے اُس شے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً کشمیر میں برف کی کوئی قدر نہیں لیکن اگر پنجاب میں منتقل کی جاوے۔ تو اُس میں قدر پیدا ہو جائیگی۔

(ب) قدر مختص بالزمان یعنی وہ قدر جو کسی شے کو ایک خاص میعاد تک

محفوظ رکھنے سے اس شے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً سردی میں برف کا ایک ٹکڑا کچھ قدر نہیں رکھتا۔ لیکن اگر موسم گرما کی آمد تک اسکو کہیں دبا کر محفوظ رکھدیا جاوے تو اس میں ایک خاص قدر کا پیدا ہوجانا ممکن ہے۔

(ج) قدر مختص بالہیئة۔ یعنی وہ قدر جو کسی شے میں ایک خاص ہیئت پیدا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً لوہے کی تلوار جو کسی مشین کی مدد سے تیار کی جائے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم اصل مطلب شروع کرتے ہیں۔ دولت کی پیدائش کے تین بڑے وسائل ہیں۔ یعنی زمین، محنت اور سرمایہ۔ مگر بعض کی رائے میں تنظیم محنت بھی پیدائش دولت کی بڑی ممد ہے۔ لہذا بعض محققین نے اسکو بھی وسائل پیدائش میں شمار کیا ہے۔ اس باب میں ہم صرف زمین کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔

زمین انسان کے لئے ایک قدرتی عطیہ ہے۔ جسکے استعمال پر نہ صرف اسکی موجودہ زندگی اور آسائش کا انحصار ہے۔ بلکہ اس کی وسعت نسل انسانی کی زیادہ سے زیادہ آبادی اور اسکی مدت بقا کو بھی متعین کرتی ہے۔ چونکہ زمین کی مختلف قسموں کی قابلیت پیداوار مختلف ہے۔ اسواسطے مختلف مقامات میں انسانی محنت کا معاوضہ بھی مختلف ہے۔

مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ کہ ہر انسانی ضرورت بلاواسطہ یا بالواسطہ اس قدرتی عطیے کے مناسب استعمال سے پوری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان دولت کے اس وسیع سرچشمہ کو زیادہ زرخیز کرنے یا اپنی ضرورت کے مطابق اس کی قابلیتوں میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے نئے نئے وسائل دریافت کرتا ہے۔ پیداوار زمین کی کمی بیشی اس کی زرخیزی اور دیگر مقامی خصوصیات

مثلاً آب ہوا۔ پانی کی افراط وغیرہ پر منحصر ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ایک اہم اور نہایت ضروری قانون کے ساتھ وابستہ ہے۔ جسکا اچھی طرح ذہن نشین کر لینا طالب علم کے لئے ضروری ہے۔

اِس قانون کو علم الاقتصاد کی اصطلاح میں قانونِ تقلیلِ حاصل کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور اِس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ ہر زمین کی قابلیت پیداوار کی ایک خاص حد مقرر ہے۔ یا یوں کہو۔ کہ پیداوار کی زیادہ سے زیادہ مقدار جو سرمائے اور محنت کے عوض میں کسی خاص زمین سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ایک خاص معین اندازہ رکھتی ہے۔ جب کوئی زمین ہمارے سرمائے اور محنت کے عوض میں زیادہ سے زیادہ پیداوار دے۔ تو ہم کہتے ہیں۔ کہ اس کی کاشت نقطۂ تقلیل تک پہونچ گئی ہے۔ یعنی اِس معین مقدار کے حاصل کر چکنے کے بعد سرمائے اور محنت کے دگنا کر دینے سے یہ ضروری نہیں۔ کہ زمین مذکور کی پیداوار بھی دگنی ہو جائے۔ بلکہ دگنی پیداوار حاصل کرنے کے لئے دگنے سے زیادہ سرمائے اور محنت کی ضرورت ہو گی۔ اگر محنتیوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے۔ تو ہر محنتی کا حصہ پیداوار کم ہو جائیگا۔ اور اِس کو کم تر معاوضے پر قناعت کرنی پڑے گی۔ اِسی طرح اگر سرمائے میں اضافہ کر دیا جائے۔ تو پیداوار کی زیادتی اِس زیادتی سے کم ہو گی۔ جو کاشت کے نقطۂ تقلیل تک پہونچنے سے پیشتر اِس اضافہ سے حاصل ہوتی۔ مثلاً فرض کرو۔ کہ ایک قطعہ زمین پر جسکی وسعت سو ایکڑ ہے۔ اور جسکی سالانہ پیداوار دو ہزار من غلہ ہے۔ دس آدمی مشترک طور پر کام کرتے ہیں۔ اِس حساب سے ایک ایکڑ کی پیداوار بیس من ہو گی۔ اور فی کس دو سو من آئے۔ لیکن اگر محنتیوں کی مذکورہ جماعت میں دو آدمی اور شامل ہو جائیں۔ اور فنِ زراعت کی ترقی

سے زمین کی زرخیزی کی کوئی نئی راہ نہ نکل آئے۔ تو کیا اس زمین کی پیداوار مندرجہ بالا حساب سے دو ہزار چار سو من ہوگی۔ یا اس سے کم و بیش؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے پہلے اس امر کا دیکھنا ضروری ہے۔ کہ آیا پہلے دس آدمیوں کی محنت اور سرمائے سے زمین مذکور کی کاشت نقطۂ تقلیل تک پہونچ گئی تھی۔ اگر کاشت اس نقطہ تک نہیں پہونچی۔ تو آئندہ سال کی پیداوار دو ہزار چار سو من سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ انقسامِ محنت کی وجہ سے جس کے فوائد کا ذکر بابِ سوم میں آئیگا۔ دس آدمیوں کی نسبت بارہ آدمی زیادہ غلہ پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر کاشت نقطۂ تقلیل تک پہونچ چکی ہے۔ تو دو آدمیوں کی زیادتی سے پیداوار دو ہزار چار سو من سے کم ہو جائیگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ بارہ آدمیوں میں ہر آدمی کو دو سو من سے کم پر قناعت کرنی پڑیگی۔ اس طرح سرمائے اور محنت کی زیادتی سے پیداوار ہر سال زیادہ ہوتی جائیگی۔ اور حصہ فی کس کم ہوتا جائیگا۔ یہاں تک کہ زمین کی کاشت کے نقطۂ تقلیل تک پہونچ جانے سے پیداوار پھر کم ہونی شروع ہو جائیگی۔ اور حصہ فی کس پہلے سے بھی کم ہوتا جائیگا۔ یہ کمی اول اول تو بتدریج ہوگی۔ لیکن بعد میں اس کی سرعت میں یہاں تک ترقی ہوگی۔ کہ زمین مذکورہ کا قطعہ موجودہ محنتیوں کے گذارے کے لئے بالکل ناکافی ہوگا۔ غالباً اس قانون کے عمل نے آریہ ہندوؤں سے وسطِ ایشیا کے میدان چھڑوائے۔ اور حضرت لوط علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جدا کیا۔ جیسا کہ توراۃ میں مذکور ہے۔ اگر زمین کی کاشت میں سرمایہ اور محنت کے بڑھتے جانے سے آخر نقطۂ تقلیل تک پہونچ جانے کا میلان نہ ہوتا۔ تو ہر مزارع تھوڑے سے قطعہ زمین کی کاشت پر قناعت کرتا۔ اور اپنا سرمایہ اور محنت صرف

کر کے بہت سی پیداوار حاصل کر لیا کرتا۔ اور لگان کے ایک بہت بڑے حصے کی ادائگی سے بچ رہتا جواب وسیع قطعات کی کاشت سے اسکو ادا کرنا پڑتا ہے۔

اِس قانون کی مزید وضاحت کے لئے ایک محقق سرمائے اور محنت کی زیادتی کو دوا کی خوراک سے تعبیر کرتا ہے۔ اور زمین کو مریض قرار دیتا ہے۔ اگر کسی زمین کے ایک قطعہ پر کچھ سرمایہ اور محنت صرف کی جائے۔ اور اس کی پیداوار صرف خرچ ہی کے برابر ہو تو اُس محقق کی اصطلاح میں ایسی زمین کی نسبت یہ کہا جائیگا۔ کہ وہ کنارۂ زراعت پر ہے۔ رفتہ رفتہ زیادہ سرمائے اور محنت کے صرف سے پیداوار زیادہ ہو جائیگی۔ یہاں تک کہ کاشت نقطۂ تقلیل تک پہنچ جائیگی۔ اور مزید سرمائے اور محنت سے پیداوار میں کوئی متناسب زیادتی نہ ہوگی۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے۔ کہ سرمائے اور محنت کا حاصل جو مندرجہ بالا قانون کی تحت میں ہے۔ پیداوار کی مقدار سے متعین ہوتا ہے۔ جو اِس سرمائے اور محنت کے عوض میں دستیاب ہوتی ہے۔ پیداوار مذکور کی قیمت کے گھٹنے بڑھنے کو اِس حاصل کی تعیین میں دخل نہیں ہے۔ ہاں جب ہم اِس قانون سے نتائج استخراج کرینگے اور بالخصوص اس اثر پر بحث کرینگے۔ جو آبادی کی زیادتی سے وسائل زندگی پر ہوتا ہے۔ اُس وقت قیمت کے تغیرات پر بھی بحث کرنا لازم ہوگا۔ اِن تغیرات کو نفس قانون سے واسطہ نہیں۔ کیونکہ اسکا تعلق پیداوار کی قدر سے نہیں ہے۔ بلکہ اسکی مقدار سے ہے۔

اِس قانون کا دخل عام ہے۔ اور یہ ہر ملک کے حالات پر صادق آتا ہے۔ [illegible] ایسا ہے۔ بالاجمال یوں

25.849

جنگلوں اور سمندر کی پیداوار بھی اِس قانون کے احاطۂ عمل میں ہے۔ اگرچہ بعض حالات میں کلوں اور دیگر ایجادات کی وجہ سے اسکا اثر چنداں ظاہر نہیں ہوتا مصنوعی اشیاء بھی اسکے اثر سے آزاد نہیں ہیں۔ کیونکہ اُنکا ہیولے یا مصالح جس سے وہ تیار ہوتی ہیں۔ زمین یا سمندر ہی سے برآمد ہوتا ہے۔ گر مصنوعات کی مختلف اقسام پر اس کا اثر اس محنت کی مقدار کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ جو اُن کی تیاری میں صرف کی جائے۔ قینچی کو ہی دیکھ لو۔ لوہے کو زمین سے نکالنے کا خرچ اِس محنت کے مقابل میں کچھ بھی نہیں۔ جو اسکی تیاری میں صرف کیجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اگر کان کی مشکلات بڑھ جانے کی وجہ سے لوہے کی قیمت دوگنی بھی ہوجائے تو قینچیوں کی قیمت پر کچھ اثر نہوگا۔ کیونکہ ان کی قیمت کے تعین میں اِس محنت کو دخل ہے۔ جو اُن کی تیاری میں صرف ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا۔ کہ جو قومیں اس قسم کی دستکاری میں مصروف ہیں۔ جو مصالح پر اپنا عمل کرتی ہے۔ اُن کو اِس قانون سے متاثر ہونیکا اندیشہ نہیں ہے۔ کیونکہ اُن کی مصنوعات کی قیمت کم وبیش اِن کی دستکاری اور محنت سے متعین ہوتی ہے۔ جس میں مصالح کے خرچ پیداوار کو بہت کم دخل ہے۔ مگر جو ملک زیادہ تر مصالح پیدا کرتے ہیں۔ اور مصنوعات کی تیاری سے عاری ہیں۔ اُن کو اِس قانون کے نتائج پر غور کرنا چاہئے۔ بالخصوص ہندوستان کے لوگوں کو۔ کیونکہ ابھی اس ملک کو صنعتی ملک کے نام سے موسوم نہیں کرسکتے اگر اس ملک کے لوگ زیادہ تر صنعت کی طرف توجہ کریں۔ تو اُن کی مالی حالت روز افزوں ترقی کریگی۔ اور مفلسی کے عذاب اور دیگر مصائب سے نجات ملنے کی صورت نظر آئیگی۔ کیونکہ اور ملکوں کی طرح اس ملک کو مصالح باہر

منگوانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ کہ جب زمین کی کاشت نقطۂ تعلیل تک پہنچ جاتی ہے۔ تو اسکی قابلیت پیداوار کم ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں۔ کہ معمولی کاشت ہی اُس کے اندرونی خواص کو زائل کرتی جائے۔ بلکہ بعض چند ایسے قدرتی اسباب بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو اس کی زرخیزی کو انتہا درجہ کا نقصان پہنچاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے۔ کہ علم طبعی کے نتائج کے رو سے کوئی شے عدم محض نہیں ہو سکتی۔ بلکہ صرف اُس کی ماہیت تبدیل ہو جاتی ہے تو اسکا جواب یہ ہے۔ کہ اگرچہ عدم محض محال ہے۔ تاہم کوئی مفید شے بدل کر ایسی ہیئت یا صورت اختیار کر سکتی ہے۔ جو اِنسان کے لئے بالکل کار آمد نہ ہو۔ مثلاً جب کوئی مکان جلکر خاک سیاہ ہو جاتا ہے۔ تو بالکل معدوم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ایک مفید ہیئت سے ایک غیر مفید ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ اِسی طرح زمین کے مفید اندرونی خواص اِنسان کے معمولی کاشت یا دیگر مضرت رسان قدرتی اسباب سے حقیقی طور پر فنا نہیں ہو جاتے۔ بلکہ ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو ہماری ضروریات کے لحاظ سے غیر مفید ہوتی ہے۔

زمین کے اِس خاصے کی بناء پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان چونکہ صنعتی ملک نہیں ہے اسواسطے یہ دیگر ممالک کے لئے ایک طرح کا ذخیرہ بن گیا ہے جہاں سے وہ اپنے صنعتی کارخانوں کے لئے مصالح حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر اُس مصالح کو اپنی دستکاری کے عمل سے نئی نئی مصنوعات کی صورت میں تبدیل کر کے دیگر ممالک اور ہندوستان میں بھیجکر اتنا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں چونکہ قانون

تقلیل رہش کے عمل کو روکنے کے اسباب بہت قلیل ہیں۔ لہٰذا جو اشیاء ہندوستان میں دیگر ممالک سے آتی ہیں اُن پر قانوناً بہت سا محصول لگنا چاہئے۔ جس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دیگر ممالک کے تاجر اپنی صنعتی اشیاء اس ملک میں نہ بیچ سکینگے۔ اور اگر بیچینگے تو اُن کو کچھ فائدہ کی توقع نہ ہوگی۔ کیونکہ زیادہ محصول کی وجہ سے اُن اشیاء کی قیمت گراں ہوجائیگی۔ اور یہاں کے لوگ اُن کو خریدنے سے باز رہینگے۔ اِس طرح ہمیں اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے خود اپنا محتاج ہونا پڑے گا۔ اور ہماری صنعت کو ترقی ہوگی۔ اِس طریق عمل کو حفاظت تجارت یا تامین تجارت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور اسکا مقصد یہ ہے کہ تمام ممالک باہمی ایک دوسرے کے دست نگر نہوں۔ بلکہ اپنی ضرورت کی چیزیں اپنے اپنے ملک کے پیدا کردہ مصالح سے خود تیار کریں۔ اس دلیل سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے۔ کہ مندرجہ بالا طریق عمل کا مقصد قوموں کے باہمی تعلقات کو قطع کرنا ہے۔ یہ نتیجہ صحیح نہیں ہے کیونکہ تامین تجارت کے مؤیدوں کا مقصد ہر ملک کے لوگوں کو صنعت کی طرف مائل کرنا ہے۔ نہ اُن کے باہمی تعلقات کو زائل کرنا۔ جو شے کسی ملک میں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتی وہ بمجبوری دیگر ممالک سے حاصل کی جائے گی اور اس طرح تجارتی تعلقات بدستور قائم رہینگے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مصالح پیدا کرنے والوں اور صنعتی اشیاء کے تیار کرنے والوں کو باہمی خرید و فروخت کرنے میں پوری آزادی حاصل ہے۔ اسواسطے کسی قسم کا محصول لگانا گویا انسان کی آزادی پر حملہ کرنا ہے۔ مگر ان کو یہ معلوم نہیں کہ بعض اوقات کسی خاص فرد کا فائدہ عام افراد قوم کے فوائد سے متناقض ہوتا ہے

تاہم مذکورہ بالا دلیل میں وہ امور نظر انداز کئے گئے ہیں جن پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔

(۱) اول تو یہ کہ نظامِ قدرت خود بخود اس کمی کو پورا کرتا ہے جو زمین کی قابلیتِ پیداوار کے رفتہ رفتہ کم ہوتے جانے سے لاحق ہوتی ہے۔ مثلاً بڑی بڑی چٹانوں کا تحلیل ہو کر وسیع قطعات زمین کی صورت میں متبدل ہوتے جانا۔

(۲) دوئم زمین کے انسانی استعمال میں اسکے کچھ نہ کچھ حصہ کا ضائع ہونا ضروری ہے۔ بلکہ بڑے بڑے تجارتی قصبوں کی تعمیر سے بھی یہ بات رک نہیں سکتی۔ اور کچھ نہیں تو ایسے قصبوں میں کچھ حصہ زمین ان نہروں کی تیاری ہی میں صرف کرنا پڑیگا۔ جنکی وساطت سے کوڑا کرکٹ وغیرہ سمندر میں پھینکا جاتا ہے۔

قصہ کوتاہ یہ بحث بڑی دلچسپ ہے۔ اور اس کے نتائج مختلف ممالک کے حالات پر منحصر ہیں۔ ہم اس پر زیادہ خامہ فرسائی نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ اس کا فیصلہ ناظرین کی رائے پر چھوڑتے ہیں۔

باب دوم

(محنت)

دولت کی پیدائش کا دوسرا وسیلہ محنت ہے۔ جس سے مراد وہ جسمانی یا غیر جسمانی (دماغی) سعی ہے۔ جو کسی مقصد کے حصول کے لئے کی جاتی ہے قطع نظر اس خوشی یا لذت کے جو اس سعی کے دوران میں حاصل ہو۔ قدرت مصالح یا ہیولے مہیا کرتی ہے۔ مگر محنت اُس کے مختلف اقسام پر اپنا عمل کرنے سے انکو مطلوبہ ہیئت میں تبدیل کرنے سے اس ہیولی کو انسانی ضروریات کے پورا کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔ اِس قمیص کو ہی لو۔ جو تم پہنے ہو۔ اس کو موجودہ مفید صورت میں لانے کے لئے محنت کے مختلف اعمال کا کسقدر طویل سلسلہ درکار ہے۔ علی ہٰذا القیاس مصنفین اور علمار کی تصانیف جنکا منشاء قوم کی اصلاح کرنا یا علوم کی اشاعت وغیرہ ہو۔ خالص دماغی محنت کی مثالیں ہیں۔

تہذیب و تمدن کے اقل درجہ کی حالت میں اِنسان کی ضروریات قدرت کی فیاضی سے خود بخود پوری ہو جاتی ہیں۔ محنت کی احتیاج نہیں ہوتی۔ اور جب تک یہ حالت قائم رہتی ہے۔ اشیار میں وہ خاصیت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ جسکو قدر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اِنسان دیگر حیوانات کی طرح خودرو پھلوں پر یا شکار پر گذران کرتا ہے۔ اِس حالت کا لازمی نتیجہ یہ ہے۔ کہ آبادی کم ہو۔ قحطوں کا تواتر ہو۔ اور زندگی کو قائم رکھنے کے لئے

قبائلِ انسانی میں باہمی جنگ و جدل کا سلسلہ قائم رہے۔ مگر جب انسان اس وحشیانہ حالت سے ترقی کر کے حالتِ شبانی تک پہنچتا ہے۔ تو اقتصادی معنوں میں محنت کا ظہور ہوتا ہے۔ اس حالت میں بنی آدم قدرت کی فیاضی کے بھروسے ہی نہیں رہتے۔ بلکہ مختلف جنگلی حیوانوں کو اپنے قبضہ میں لاتے ہیں۔ پانی کے غیر مستقل ذخیرہ کے لئے نہریں کھودتے ہیں۔ بلکہ آیندہ خشک سالی کے فکر سے خور و نوش کا سامان جمع کرنا اور اپنے حیوانوں کی حفاظت کرنا بھی سیکھتے ہیں۔ غرضکہ محنت کی مندرجہ بالا صورتوں کی وساطت سے وہ تمام اشیاء دولت بن جاتی ہیں۔ جو انسان کی وحشیانہ حالت میں اس خاصیت سے معرا تھیں تمدن کی اس حالت میں آبادی دن بدن زیادہ ہوتی ہے۔ اور خورد نوش کا سامان صرف کثیر ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ بیرونی خطرات سے محفوظ بھی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ انسان کی ذاتی محنت سے قحط کا تواتر رک جاتا ہے۔ اور اُن کے گزارے کی سبیل یقینی ہو جاتی ہے۔ آخرکار یہ مرحلہ بھی طے ہو جاتا ہے۔ اور انسان ترقی کر کے اس حالت تک پہنچتا ہے۔ جسکو حالتِ زراعتی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ خانہ بدوشی چھوٹ جاتی ہے۔ آبادی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اور محنت کا ہاتھ زمین کے مخفی خزانوں کو غلہ اور دیگر اجناس کی صورت میں نکالنا شروع کرتا ہے۔

اوپر کی سطور سے واضح ہو گیا ہوگا۔ کہ پیدائش دولت کے لئے محنت لازم ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ ہر محنت دولت آفرین نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ محنت کی دو بڑی اصناف قرار دی گئی ہیں۔ یعنی

(۱) محنتِ بار آور۔ اور

(۲) محنتِ غیر بار آور۔

معدوم الذکر سے مراد وہ محنت ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ مسلسل طور پر مزید دولت
پیدا کرتی رہے۔ اور آخر الذکر سے مراد اس محنت کی ہے۔ جو مسلسل طور پر مزید
دولت پیدا نہ کر سکے۔ مثلاً مفید اور ضروری اشیاء تیار کرنے والے معماروں
آہنگروں یا سپاہیوں اور استادوں کی محنت بار آور ہے۔ برخلاف اسکے
آتشبازی بنانے والے کی محنت غیر بار آور ہے۔ کیونکہ آتشبازی کا دستکار
بجائے اس کے کہ مسلسل طور پر مزید دولت پیدا کرے۔ قومی دولت کو کم کرتا ہے
مثال کے طور پر فرض کرو۔ کہ کسی جگہ صرف دو آدمی آباد ہیں۔ ایک کے پاس
دس روپے ہیں۔ اور دوسرے کے پاس پانچ یعنی اُن کا کل سرمایہ پندرہ
روپیہ ہے۔ فرض کرو کہ جس شخص کے پاس پانچ روپے ہیں۔ وہ اپنا سرمایہ آتشبازی
کی تیاری میں صرف کرتا ہے۔ اور شے مذکور کے تیار ہونے پر اُسے اپنے
تماشہ پسند ساتھی کے پاس لے جاتا ہے۔ جو آتشبازی کو دس روپیہ پر خرید لیتا ہے
ظاہر ہے۔ کہ دونو کا سرمایہ جو پہلے پندرہ روپیہ تھا۔ اب صرف دس روپیہ رہ گیا ہے
جو آتشباز کے قبضہ میں ہے۔ کیونکہ آتشبازی اپنے مالک کو ایک عارضی خوشی
دیکر تھوڑی دیر کے بعد بالکل معدوم ہو جائیگی۔ لہذا تمام غیر بار آور محنت جو اسباب
تن آسانی پر صرف ہوتی ہے۔ اگرچہ بادی النظر میں سرمایہ داروں کو محنتِ بار آور
کے مانند منافع خیز معلوم ہوتی ہے (جیسا کہ مثالِ بالا میں ہمارے آتشباز کو
اپنی تجارت سے پانچ روپیہ منافع معلوم ہوتا ہے) تاہم انجام کار قومی دولت
کی مقدار کو کم کرتی ہے۔ کیونکہ یہ محنت اور سرمایہ جو اسپر صرف ہوتا ہے۔ گویا
ایسی اشیاء کی تیاری میں صرف ہوتا ہے۔ جو کچھ عرصہ کے بعد قدر سے معرا
ہو کر بالکل معدوم ہو جاتی ہیں۔ اور اس وجہ سے مسلسل طور پر مزید دولت کے پیدا
کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتیں۔ اگر غور سے دیکھو گے۔ تو تمہیں معلوم ہوگا۔

کہ بخیلوں اور عشرت پسندوں کا وجود قومی دولت کو یکساں مضرت رساں ہے۔ بخیل بھی عشرت پسندوں کی طرح دولت کو ایک طرح سے فنا ہی کرتا ہے۔ کیونکہ جو دولت صندوق میں بند رہے۔ اور مزید دولت کے پیدا کرنے میں صرف نہو۔ اُسکا عدم وجود برابر ہے غرضکہ محنت کا بار آور یا غیر بار آور ہونا۔ اور سرمایہ کا بار آور یا غیر بار آور طور پر استعمال ہونا مزید دولت پیدا کر سکنے یا نہ کر سکنے کی قابلیت پر منحصر ہے۔ معلم کی محنت بار آور ہے۔ کیونکہ وہ اوروں کو اس قابل بناتا ہے۔ کہ مزید دولت پیدا کریں۔ علیٰ ہذا القیاس سپاہی کی محنت بھی بالواسطہ بار آور ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کرتا ہے۔ جو مزید دولت کے پیدا ہونے کی ایک ضروری شرط ہے۔ اسی طرح دیگر دستکاروں یعنی سناروں آہنگروں وغیرہ کی محنت بھی بشرطیکہ اسباب تن آسانی پر صرف نہو۔ بار آور ہے۔ کیونکہ اُن کی محنت سے ایسی اشیاء تیار ہوتی ہیں۔ جن سے سلسلہ وار مزید دولت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ برخلاف گوٹا بنانے والے کی محنت کے۔ کہ اسکا نتیجہ ایک ایسی شے ہے۔ جو خریدنے والے کو ایک عارضی خوشی یا آسائش تو دیتی ہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد فنا ہو کر دولت کی آیندہ پیدائش کے سلسلہ کو یک قلم منقطع کر دیتی ہے۔ مندرجہ بالا امتیاز کی بنا پر ظاہر ہے۔ کہ ہر ملک میں بعض دستکار اور سرمایہ دار تو ایسے ہوتے ہیں۔ جو اپنی محنت اور سرمایہ کو ضروریات زندگی کے پیدا کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ اور بعض صرف اسباب عشرت و تن آسانی ہی کو پیدا کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کے حالات زندگی اس کے خیالات اور قوی میں ایک قسم کا تغیر آتا رہتا ہے۔ جس سے یہ امکان

ہو جاتا ہے۔ کہ جو چیز اس سے سو سال پہلے اسبابِ تن آسانی میں سے تصور کی جاتی۔ اب اخلاقی حالات کی وجہ سے ضروریاتِ زندگی میں شمار کی جائے لہٰذا تہذیب و تمدن اعلیٰ مدارج میں ضروریاتِ زندگی اور اسبابِ تن آسانی یا بالفاظِ دیگر یوں کہو۔ کہ محنت بار آور اور غیر بار آور میں تمیز کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ اِس ضمن میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ مندرجہ بالا توضیح پر دو اعتراض ہو سکتے ہیں۔

(۱) فرض کرو کہ ایک استاد بیس لڑکوں کو تعلیم دیتا ہے۔ جن میں سے آخر کار دس طلباء معزز عہدوں پر ممتاز ہوئے۔ مگر باقیوں نے مرفہ الحال ہونے کی وجہ سے کوئی ملازمت یا تجارت وغیرہ نہ کی۔ ظاہر ہے۔ کہ محنتِ بار آور کی تعریف کی رو سے استاد کی محنت کا وہ حصہ جو پہلے دس کی تعلیم پر صرف ہوا ہے۔ بار آور ہے۔ کیونکہ اس سے مسلسل طور پر مزید دولت پیدا ہو رہی ہے لیکن وہ حصہ جو باقی دس کی تعلیم پر صرف ہُوا ہے۔ غیر بار آور ہے۔ کیونکہ اس سے مسلسل طور پر مزید دولت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک ہی قسم کی محنت ایک حالت میں بار آور اور دوسری حالت میں غیر بار آور ہو؟ اس اعتراض کا جواب یہ ہے۔ کہ علمِ اقتصاد واقعات کے اسباب و علل معلوم کرتا ہے۔ اور اِس بات پر بحث کرتا ہے۔ کہ اگر بعض مانع اسباب نہ پیش آ گئے۔ تو فلاں واقعہ اس طرح پر ظہور پذیر ہوگا۔ استاد کی محنت دونو صورتوں میں بار آور ہونے کا میلان رکھتی ہے۔ لیکن چونکہ دوسری صورت میں طلباء کی بے پروائی یا دیگر موانع پیش آ گئے ہیں۔ اِس واسطے غیر بار آور ہو گئی ہے۔

(۲) تم شاید یہ کہو گے۔ کہ اگر کسی شے کے بار آور استعمال سے

یہی مراد ہے۔ کہ اس سے مسلسل طور پر مزید دولت پیدا ہوتی جائے۔ تو جو روپیہ ہم لنگڑوں اپاہجوں اور معذوروں کو بطور خیرات کے دیتے ہیں۔ وہ بھی غیر بار آور طور پر صرف ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس سے کوئی مزید دولت پیدا نہیں ہوتی۔ بے شک یہ خیال صحیح ہے۔ اور اسی خیال سے ایک مشہور انگریزی مصنف لکھتا ہے۔ کہ علم الاقتصاد کے اصول اور نتائج انسان کے ذاتی تاثرات کے صریح مخالف ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ اگر اس علم کے اصول کی رو سے خیرات کا روپیہ غیر بار آور طور پر صرف ہوتا ہے۔ تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ کہ خیرات دینی ہی نہیں چاہئے۔ علم الاقتصاد واقعات پر بحث کرتا ہے۔ نہ فرائض انسان پر۔ نظری طور پر کسی امر کا صحیح ہونا اس بات کا مستلزم نہیں ہے۔ کہ وہ امر اس وجہ سے ہمارے فرائض سے ہی خارج ہے۔ فرائض انسان کی تعیین علم الاقتصاد کا کام نہیں ہے۔ بلکہ انکا فیصلہ علم اخلاق کے اصول پر ہوتا ہے۔ جو بہ حیثیت ایک علم ہونے کے علم الاقتصاد سے الگ ہے۔ بلکہ اگر تم غور کر کے دیکھو گے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ نظام تمدن کے بقاء اور اس کے استحکام کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ قومی دولت کا کچھ حصہ فنا بھی ہوتا رہے۔

اس امتیاز کا اصلی مفہوم ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ جاننا ضروری ہے کہ کسی ملک میں محنت کی پیداوار کا کم و بیش ہونا مندرجہ ذیل اسباب پر منحصر ہے۔ خواہ وہ ملک حالت شبانی میں۔ خواہ زراعتی حالت میں خواہ تہذیب و تمدن کے اس درجہ پر ہو جبکہ صنعت و تجارت انتہائے عروج پر ہوتی ہے۔

(۱) دستکاروں یا محنتیوں کی کارکردگی۔

(۲) انقسامِ محنت یا محنت کے مختلف اعمال اور حصص کا مختلف افراد پر تقسیم کرنا۔ اور اس طریق سے اُنکی تخصیص و تنظیم کرنی۔

محنت کی کارکردگی

محنتی کی کارکردگی کئی اسباب پر منحصر ہے۔

(اول) اسکی موروثی ہمت یا قوا سے جو قدرت نے اُسے عطا کئے ہوں۔ قدرت کا یہ عطیہ مختلف اقوام کی حالت میں مختلف ہے بعض قومیں قدرتاً قوی اور مضبوط ہوتی ہیں۔ بعض قدرتاً دُبلی پتلی اور مقابلۃً ضعیف۔ یہی حال افراد کا ہے۔ مگر اس اختلاف کی علت پر بحث کرنا علم اقتصاد کا کام نہیں ہے۔

(دوم) محنتی کی غذا کی کیفیت اور کمیت۔

(سوم) محنتی کا سامان حفظِ صحت۔ صاف اور ہوادار مکانوں میں رہنے سے اس کی صحت پر ایک نمایاں اثر ہوگا۔ جس سے اس کی ہنرمندی ترقی کریگی۔

(چہارم) محنتی کی فطرتی ذہانت۔ ذہین محنتی بہ نسبت غبی محنتی کے کئی وجوہ سے زیادہ کارکن ہوتا ہے۔

(۱) تو اسے اِس امر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کہ اُس کی شاگردی کی مدت طویل ہو۔

(۲) اس پر نگرانی کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔

(۳) وہ اشیا کی تیاری میں کم نقصان کرتا ہے۔

(۴) وہ کل کا استعمال جلد سیکھ جاتا ہے۔

(۵) زندگی کی دوڑ میں بڑھنے کی آرزو - جو کہ خودداری اور غیرت سے پیدا ہوتی ہے - اور اس امر کا یقین کہ پیداوارِ محنت کی افزائش کے ساتھ ساتھ اسکا حصہ بھی بڑھتا جائیگا -

مندرجہ بالا اسباب میں سے پہلے تین اسباب طبعی ہیں - چوتھا عقلی اور پانچواں اخلاقی ہے - تمکو معلوم ہے - غلاموں کی محنت آزاد محنتیوں کی محنت کا مقابلہ نہیں کر سکتی - اسکی وجہ کیا ہے ؟ غلاموں کی محنت کارکردگی کی وقعت سے کیوں معرا ہے ؟

صاف ظاہر ہے - کہ آزاد محنتیوں کی طرح اسے زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے اور اپنے ہمراہیوں پر فوق لیجانے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی - اور نہ ہو سکتی ہے - تازیانہ کا خوف ان قوائے کو حرکت میں نہیں لاسکتا - جنکی تحریک صرف تمنائے دولت اور خودداری کی خلش سے ہوتی ہے - آزاد محنتیوں کی صورت میں بھی اُجرت کا قطعی اور یقینی ہونا ان کے لئے انتہا درجہ کا قوی محرک ہوتا ہے - اور اگر کسی مالک کا نہیں - بلکہ اپنا کام کر رہے ہوں - تو اپنی محنت کی کارکردگی کے زیادہ کرنے میں اور بھی کوشش کرتے ہیں - وجہ صرف یہی ہے - کہ وہ اپنے آپ کو اپنی محنت کی پیداوار کا پورا مالک تصور کرتے ہیں - کسی نے کیا خوب کہا ہے " حقِ ملکیت ایک اکسیر ہے جو تانبے کو سونا بنا دیتا ہے " یہ بھی یاد رکھنا چاہئے - کہ بعض ممالک میں قانون ہی کچھ اس ڈھب کے وضع کئے جاتے ہیں - کہ قوم کے دستکار اُن کے اثر سے دان بدن سست ہوتے جاتے ہیں - کیونکہ بسا اوقات یہ قانون انکو اپنی محنت کا پورا فائدہ اُٹھانے سے روکتے ہیں - کچھ عرصہ گزرا ہے - کہ سلطنت [illegible] میں متعدد قانون اسی طرح سے وضع کئے گئے تھے -

کہ اِن بیچاروں کی جان کا ہی۔ کوہ کندن و کاہ بر آوردن کی مصداق تھی یہی وجہ تھی۔ کہ اُن لوگوں کے مزاج میں ان بدن کاہلی ترقی کرتی گئی۔ مگر جب اِس قسم کے بیہودہ قوانین منسوخ کر دئے گئے۔ تو انہوں نے اپنی جبلی چُستی اور استقلال کو پھر حاصل کر لیا۔ پس تمام اسباب ہیں جو محنت کی کارکردگی میں اختلاف پیدا کرتے ہیں۔

اِنقسامِ محنت

کسی قوم کی قوتِ محنت[1] کا دوسرا جزو انقسامِ محنت ہے۔ تہذیب و تمدن کے ابتدائی مراحل میں ہر انسان اپنی ذاتی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے سارا کام خود کرتا ہے۔ اپنی جھونپڑی کا معمار بھی آپ ہی ہوتا ہے اور اپنے شکار کے لئے تیر و کمان، اور دیگر اوزار بھی آپ ہی تیار کر لیتا ہے۔ مگر اس حالت میں بھی کسی نہ کسی حد تک اِنقسامِ محنت کا اصول عمل میں ضرور آتا ہے۔ عورت سوت کاتتی ہے۔ پہننے کے لئے کپڑے تیار کرتی ہے۔ کھانا پکاتی ہے۔ لیکن مرد اور کام کرتا ہے۔ جن میں قوت اور چُستی کی زیادہ ضرورت ہے۔ رفتہ رفتہ محنت کا انقسام جنسیت کے امتیاز پر مبنی نہیں رہتا۔ بلکہ ذاتی قابلیت کے اختلاف پر مبنی ہو جاتا ہے۔ افراد میں سے کوئی لوہار کوئی زرگر کوئی بڑھئی بن جاتا ہے۔ اور اس طرح آخر کار ہر پیشہ کے مختلف حصے مختلف جمیعتوں کے ساتھ مختص ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر ممالک میں ذات پیشہ کے لحاظ سے قرار دی جاتی ہے۔ ہندوستان کو ہی۔ لوہار

[1] کسی قوم کی قوتِ محنت سے مراد اس قوم کے دستکاروں کی تعداد انکا ہنر اور ایمانداری وغیرہ ہیں

اں اصولِ انقسامِ محنت کا اثر اس درجہ تک ہوا کہ درزی لوہار بڑھئی وغیرہ ذاتیں قرار پاگئیں۔ اور اس امتیاز پر اسقدر بےجا زور دیا گیا کہ اس کے مضرت رساں نتائج بالکل نظر انداز کر دیئے گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تہذیب و تمدن کے ابتدائی مراحل میں یہ امتیاز قوموں کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی شے کے ایک خاص صورت میں مفید ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ شے ہر حالت میں مفید ہے۔

انقسامِ محنت سے دولت کی پیداوار روز افزوں ترقی کرتی ہے۔

(۱) اس کی وجہ سے شاگردی کی مدت کم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جب محنتی کو کسی پیشے کا صرف ایک خاص حصہ ہی سیکھنا ہوگا تو ظاہر ہے کہ اسکے سیکھنے کی مدت اس مدت سے بہت کم ہوگی جو اس پیشہ کی تمام شاخوں کے سیکھنے میں صرف ہوتی۔

(۲) ایک خاص شاخ کی مزاولت سے اسکے ہاتھ کی صفائی بڑھ جائے گی۔

(۳) جب ایک محنتی کسی پیشے کی ایک خاص شاخ کے لئے مختص ہو جائے تو اس کو اس پیشے کی دیگر شاخوں سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ اور عدم انقسام کی صورت میں جو وقت ایک شاخ سے دوسری شاخ کی طرف جانے اور پیشے کے مختلف اعمال کی اول بدل میں صرف ہوتا تھا۔ انقسامِ محنت کی صورت میں بچ جائیگا۔

(۴) چونکہ ہر محنتی کی توجہ پیشے کی کسی خاص شاخ یا عمل پر بندول رہا کرے گی اسواسطے وہ اپنے مقررہ کام کو سہولت آسانی اور صفائی کے ساتھ سرانجام دینے کی راہیں ایجاد کرنے کی کوشش کریگا۔ اگر یہ دنیا کی بڑی بڑی ایجادات

علمی ترقی کا نتیجہ ہیں - تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انکا بہت سا حصہ اصول انقسام محنت کے اثر سے ظہور میں آیا ہے۔

(۵) انقسام محنت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ کام محنتیوں کی قابلیت کے مطابق تقسیم ہوگا۔ لہذا بچے اور عورتیں بھی اپنی اپنی قابلیت کے مطابق ملک کی دستکاری سے بہرہ ور ہوں گی۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ تو تمہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ انقسام محنت کسی ملک کی صنعت کے لئے کہاں تک مفید ہے۔ لیکن اگر اسی اصول کو دنیا کی تمام اقوام و ممالک پر وسعت دی جاوے یا یوں کہو کہ محنت کی مقامی تقسیم کی جاوے تو اس کے فوائد اور بھی نمایاں معلوم ہوں گے - ہر ملک وہی شے پیدا کریگا جسکے پیدا کرنے کی خصوصیت کے ساتھ اسے قابلیت ہے۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ وہ ملک اس خاص شے کے پیدا کرنے میں کمال حاصل کرتا جائیگا۔

جو لوگ اصول "آزاد تجارت" کے مخالف ہیں۔ اُن کی بڑی دلیل یہی ہے کہ قوموں کے تجارتی تعلقات پر کسی قسم کی روک پیدا کرنا گویا لوگوں کو اُن بڑے بڑے فوائد سے محروم کرنا ہے - جو محنت کی مقامی تقسیم کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ ہر شخص یہ حق رکھتا ہے - کہ اپنی ضرورت کی چیزیں اُسی ملک یا بازار سے خریدے - جہاں وہ کم سے کم قیمت پر دستیاب ہو سکتی ہیں۔

تم جانتے ہو - کہ ہر قوم کے تمدنی اور ملکی حالات کم و بیش مختلف ہیں - لہذا اُن کی دستکاری میں بھی کم و بیش اختلاف ہے۔ ملکی کسی کو کسی شے کی تیاری میں کمال حاصل ہے - یا ملکی اور قومی حالات کی وجہ سے ہو سکتا ہے

اور کسی کو کسی اور شے کی تیاری ہیں۔ اگر اس قدرتی امر کو ملحوظِ خاطر رکھ کر دنیا کی محنت کو اس طور پر مرتب و منتظم کریں۔ کہ ہر ملک انہیں اشیاء کے پیدا کرنے میں مصروف رہے۔ جنکے تیار کرنے میں اُسے خاص طور پر قابلیت حاصل ہے۔ یا یوں کہو۔ کہ دستکاری کی مختلف شاخیں ایک ایک قوم یا مقام کے ساتھ مختص سمجھی جاویں۔ تو ظاہر ہے۔ کہ اس تنظیم سے بے انتہا فوائد منتج ہونگے۔ محنت کی کارکردگی پر ایک نمایاں اثر ہوگا۔ بنی نوعِ انسان ایک بڑے جسم کی طرح ہیں۔ کہ مختلف ممالک یا اقوام اس کے اعضاء ہیں۔ جو اپنے اپنے مقررہ فرائض کی انجام دہی سے "بنی آدم اعضائے یک دیگراند" کا پورا مفہوم ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس طرح جسم کی پرورش اور ترتیب کرتے ہیں۔ پس قطع نظر ان فوائد کے جو انقسامِ محنت سے پیدا ہوتے ہیں اور جنکا اوپر ذکر کیا گیا ہے تنظیم محنت کا اول تو یہ فائدہ ہوگا۔ کہ دستکاری کی مختلف شاخوں کی تقسیم سے مختلف پیشہ وروں کے کام کی خوبی کا مقابلہ ہو سکیگا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ان کے درمیان ایک قسم کا رشک پیدا ہو جائیگا۔ اور ہر پیشہ ور اس رشک کے جوش میں یہ سعی کریگا۔ کہ اسکا کام خوبی میں اوروں کے کام سے بہتر ہو۔ علاوہ اس کے تنظیمِ محنت کی وجہ سے مالکان یا کارخانہ داروں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو جائیگی۔ جو اپنی ذاتی منفعت کی خاطر ہمیشہ یہ سوچتے رہینگے کہ ملک کی دستکاری مفید ترین راہوں میں صرف ہو۔ اگرچہ مالکوں کی ایک علٰحدہ جماعت کے قائم ہو جانے سے اول اول کسی قدر نقصان ہوگا۔ کیونکہ دستکار کو اپنے کام میں ایسی ذاتی دلچسپی نہ رہیگی۔ تاہم مجموعی طور پر اس جماعت کا اثر مفید ہوگا۔

مگر یاد رکھنا چاہئیے کہ تنظیم محنت کے لئے یہ ضروری ہے کہ دستکاری کے مختلف مرکزوں کے درمیان پیام رسانی اور ارتباط کے دیگر ذرائع کا پورا انتظام ہو۔ ورنہ بیگانگی اور عدم تعلق سے بعض اوقات خوفناک نتائج پیدا ہونے کا اندیشہ ہوگا۔

۱۸۶۰ء میں جبکہ ممالک مغربی و شمالی ایک ہیبت ناک قحط کی مصیبت سے پامال ہو رہے تھے۔ بعض اضلاع میں چاول کا نرخ چار روپیہ فی من تھا۔ کہ بعض اضلاع میں دو روپیہ من سے بھی کم تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ مختلف اضلاع کے درمیان تجارتی تعلقات کو قائم رکھنے کے لئے کافی سڑکیں موجود نہ تھیں۔ جنکی وجہ سے قحط زدہ اضلاع اُن اضلاع کی پیداوار سے فائدہ اُٹھا سکتے جن میں مقابلۃً ارزانی تھی۔ موجودہ حکام ہندوستان کی دُور اندیشی سے اب اِس ملک کے مختلف حصص میں تجارتی تعلقات پیدا ہونیکا سامان دن بدن زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اور امید کی جاتی ہے کہ آیندہ اِس قسم کے دردناک مصائب کا تواتر نہوگا۔ اِس ضرورت کے لحاظ سے ایک محقق اِس بات پر زور دیتا ہے کہ بستیاں آباد کرنے والوں کے قطعات زمین قریب قریب ہونے چاہئیں۔ ورنہ ہر جماعت صرف وہی اشیاء پیدا کریگی، جو اُن کی ذاتی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے کافی ہوں گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اُن کے درمیان تجارتی تعلقات پیدا نہ ہونگے۔ اور اُن کو اِن تمام خطرات کا اندیشہ رہے گا۔ جو عدم سلسلۂ آمد و رفت سے پیدا ہوتے ہیں۔

اب ہم مختصر طور پر گذشتہ دو باتوں کی بحث کا نتیجہ تحریر کرتے ہیں۔ تاکہ مندرجہ بالا امور وضاحت کے ساتھ ذہن نشین ہو جائیں۔ باب اول

میں تمہیں معلوم ہوچکا ہے۔ کہ پیدائش دولت کے قدرتی اسباب ایک بڑے قانون کے تابع ہیں۔ جسکو قانون تقلیل حاصل کے نام سے موسوم کیا کرتے ہیں۔ مگر باب دوم میں ہم نے اس بات کی کوشش کی ہے۔ کہ تنظیم محنت سے پیدائش دولت انتہا درجہ کی ترقی کرتی ہے۔ اگر قانون تقلیل حاصل کی رو سے پیداوار دولت میں نقطۂ تقلیل تک پونچکر دن بدن کم ہوتے جانیکا میلان ہے۔ تو تنظیم محنت۔ فن زراعت کی ترقی اور اس فن کے دیگر متعلقہ ایجادات اور سرمایہ کا زیادہ دوراندیشی سے استعمال کرنا اسکی افزائش کے اسباب ہیں۔

انسان کی آبادی دن بدن بڑہتی جاتی ہے۔ اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ اسکی ضروریات بھی بڑہتی جاتی ہیں۔ لہذا اگر وہ صرف قدرتی اسباب کی پیدائش کے بھروسہ پر رہتا۔ اور اپنی روزافزوں ضروریات کے پورا کرنے کی نئی نئی راہیں نہ نکالتا۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہو۔ کہ اپنی عقل کی زور سے قانون تقلیل حاصل کے اثر کا مقابلہ نہ کرتا۔ تو اس کی امن و آسائش میں انتہا درجہ کا خلل پیدا ہوتا۔ بلکہ اسکی نسل کا بقا ہی محال ہوجاتا۔ پس ظاہر ہے کہ اصول تنظیم محنت اور اصول تقلیل حاصل ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ جن میں ایک قسم کی جنگ چلی جاتی ہے۔ جس سے پیدائش دولت میں اعتدال قائم رہتا ہے۔ اور اعتدال ہی ہرشے کی جان ہے۔

بابِ سوم

(سرمایہ)

نوعِ انسان کے ابتدائی مراحلِ تہذیب میں سرمایہ کا وجود مطلق نہ تھا۔ پیداوارِ دولت کے صرف دو وسائل تھے یعنی محنت اور زمین۔ مگر موجودہ نظامِ تمدن میں سرمایۂ دولت کی پیدائش کے لئے ایسا ہی ضروری ہو گیا ہے جیسا کہ محنت اور دیگر قدرتی اسباب۔ اس لئے دولت کی پیدائش ناممکن ہے جب تک کہ موجودہ صرف میں سے کچھ حصہ بچا کر مزید دولت کے پیدا کرنے میں استعمال نہ کیا جائے۔ لہذا نظامِ تمدن کی موجودہ صورت میں کسی ملک کا سرمایہ اس ملک کی دولت کا وہ حصہ ہے۔ جو دولت کی آئندہ پیدائش کے لئے الگ رکھا جاتا ہے۔ کسی ملک کی دولت کا وہ حصہ جو اسبابِ تن آسانی پر صرف کیا جاتا ہے۔ یا اسبابِ تن آسانی کی تیاری میں لگایا جاتا ہے۔ بادی النظر میں تو سرمایہ دار کو نفع دیتا ہے۔ لیکن چونکہ انجام کار قومی دولت پر اسکا اثر اچھا نہیں ہوتا۔ اسواسطے علم اقتصاد کے اصول کی رو سے ہم نہیں کہہ سکتے۔ کہ یہ حصہ بطورِ سرمایہ صرف ہوا ہے۔ بلکہ اس کے استعمال کو غیر بار آوری کہا جائیگا۔ بشرطیکہ یقینی اور قطعی طور پر یہ معلوم ہو جائے۔

سلہ زمین افتادہ اور دیگر قدرتی اسباب جبکہ سرمائے اور محنت کی وساطت سے ان کی قابلیت افادت معمول سے زیادہ نہ ہو گئی ہے۔ سرمائے میں داخل نہیں ہیں۔ اس استثناء کی وجہ آگے معلوم ہوگی۔

کہ وہ اشیاء جو اس حصۂ دولت کی وساطت سے تیار ہوتی ہیں۔ یا خریدی جاتی ہیں۔ وہ بھی اسبابِ تن آسانی میں داخل ہیں۔ غرض کہ اگر سرمایہ بچت کا نتیجہ ہے۔ اور سرمایہ دار کے کم خرچ اور کفایت شعار ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

بعض مصنفین کہتے ہیں۔ کہ کسی ملک کی آب و ہوا بھی جہاں تک کہ مزید دولت کی پیداوار میں مدد دیتی ہے۔ اِس ملک کے سرمائے کا حصہ ہے۔ لیکن چونکہ دولت وہ شے ہے۔ جو بازار میں کوئی معین قدر رکھتی ہو۔ اسواسطے کسی ملک کے مفید قدرتی اسباب مثلاً آب و ہوا یا اسکا جغرافی مقام وغیرہ اس ملک کے سرمائے میں داخل نہیں تصور کئے جا سکتے۔ اگرچہ یہ پیدائش دولت کے ممد ضرور ہیں۔ سرمائے کی اصلیت مندرجہ ذیل مثال سے واضح ہو سکتی ہے فرض کرو کہ انسانوں کا ایک قبیلہ سمندر کے کنارے پر آباد ہے۔ اور مچھلی پر گذارہ کرتا ہے جب مچھلی کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔ تو اُن کے دن بھی اچھے گذر جاتے ہیں۔ مگر برعکس حالات میں ان لوگوں کو قحط کی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ اب فرض کرو کہ اُن میں سے ایک آدمی اپنے ہم جنسوں کی نسبت امیرانہ گذارہ کرنے کی خاطر مچھلی کا ایک ذخیرہ جمع کرتا ہے۔ یہ ذخیرہ دولت تو ضرور ہے۔ مگر اسکا سرمایہ ہونا اس کے استعمال پر منحصر ہے۔ اگر غیر بارآور طور پر استعمال ہوگا۔ تو بطور سرمایہ صرف نہ ہوگا۔ لیکن اگر مزید دولت کی پیدائش میں صرف ہوگا۔ تو سرمایہ کہلائیگا۔ بالفرض قحط کے موسم میں یہ شخص اپنے ذخیرہ کو ساتھ لیکر کسی جنگل کی طرف نکل جاتا ہے۔ اور وہاں جاکر فراغت سے ایک کشتی تیار کرتا ہے۔ جس کی وساطت سے سمندر کے دور دور از حصوں میں اس کی رسائی ہو سکتی ہے۔ جہاں ساحل کی نسبت

زیادہ مچھلی مل سکتی ہے۔ اِس صورت میں کشتی مذکور سرمایہ کہلائیگی۔ اور یہ شخص سرمایہ دار ہوگا۔

اب اس شخص کے لئے تین راہیں کھلی ہیں۔

(اول) تو یہ کہ اپنی کشتی خود استعمال کرے۔ اور ماہی گیری کی آمدنی سے اپنے ہم جنسوں کی محنت ایک خاص معاوضے کے بدلے خریدے اور اس طرح آرام میں بسر کرے۔

(دوم) یا اپنی کشتی کسی اور کو اجارہ پر دے دے۔ اور خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے گھر میں بیٹھا رہے۔

(سوم) یا اپنی کشتی کسی اور کو اجارہ پر دیدے۔ اور خود اور کشتیاں تیار کرنے میں مصروف رہے۔ فرض کرو۔ کہ کشتی بنانے والا تیسری راہ اختیار کرتا ہے۔ اور اسے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کی صنعت کے گاہک بہت ہیں۔ جُوں جُوں وہ زیادہ کشتیاں تیار کریگا۔ ووں ووں اسکا ہاتھ بھی صاف ہوتا جائیگا۔ اور وہ دن بدن اس قابل ہوتا جائیگا۔ کہ اجرت کے معاہدہ پر اپنے دیگر ہم جنسوں کو بھی اپنے ساتھ اس کام میں لگائے۔ کیونکہ خریداروں کی کثرت کی وجہ سے وہ اکیلا اتنی کشتیاں نہیں تیار کر سکیگا۔ اب اسکی روز افزوں ترقی دیکھ کر اوروں کو بھی کشتیاں بنانے کی تحریک ہوگی۔ اور کشتی گروں میں ایک قسم کی تجارتی رقابت شروع ہو جائیگی۔ اور منافع کی شرح کم ہوتی جائیگی۔ آخرکار یہاں تک نوبت پہنچیگی۔ کہ کشتیوں کی مزید مانگ نہ رہیگی۔ اور اس وجہ سے سرمایہ دار کم منافع کے خیال سے کشتی گری کو چھوڑ کر معماری کے کام پر اپنا سرمایہ صرف کرنے لگیں گے۔ یا قبیلے کی دیگر ضروریات کا سامان مہیا کرینگے۔ اِس طرح جُوں جُوں قبیلے کی ضروریات

بڑہتی جائیگی یا یوں کہو۔ کہ جُوں جُوں قبیلۂ مذکور تہذیب و تمدن میں ترقی کرتا جائیگا۔ ووں ووں اسکا سرمایہ بھی مختلف صورتیں اختیار کرتا جائیگا۔

مثالِ مندرجہ بالا سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سرمایہ اول اول ذخیرے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ کیونکہ کشتی بنانے والے کے لئے یہ ضروری تھا۔ کہ پہلے ایام کشتی گری کے لئے اپنی خور و نوش کا سامان مہیا کرے۔ اُسکے بعد سرمایہ کشتی گری کی اوزاروں کی صورت اور بالآخر اس مصالح کی صورت میں جس سے کشتیاں تیار ہوتی ہیں منتقل ہوگیا۔ غرضکہ ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ کسی قوم کا سرمایہ اِس قوم کی دولت کا وہ حصہ ہے۔ جو دولت کی نئی نئی صورتیں پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور جسکی تقسیم مندرجہ ذیل طریقہ پر ہو سکتی ہے۔

(۱) وہ سرمایہ جو مزید دولت کی پیدائش کے ایام میں سرمایہ داروں اور محنتیوں کی خور و نوش میں صرف ہو۔

(۲) اوزار۔ یعنی مختلف پیشوں کے ہتھیار۔ آلات و کلیں وغیرہ۔

(۳) مصالح۔ جس میں دولت کی وہ تمام صورتیں شامل ہیں۔ جو سامان معاش اور اوزاروں کے علاوہ ہوں۔

مقدم الذکر صورت میں اسے سرمایہ دائر کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک ہیئت سے منتقل ہو کر دوسری ہیئت اختیار کرلیتا ہے۔ مثلاً محنتیوں کی اُجرت اُن کی اشیاء خور و نوش کی چیزیں قوائے حیات کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ مؤخر الذکر دو صورتوں میں اسے سرمایۂ قائم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ کیونکہ سرمایۂ مذکور ایک مستقل اور غیر متبدل ہیئت اختیار کرتا ہے جس سے رفتہ رفتہ مزید دولت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اگرچہ

تہذیب و تمدن کی تمام حالتوں میں سرمایہ انہی تین صورتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن زمانۂ حال کے مہذب ممالک میں اشیاء مادیہ کے علاوہ اعتبار اور حقوق مجردہ مثلاً حق نالش وغیرہ بھی سرمایہ کے طور پر مستعمل ہوتے ہیں۔ زمانۂ حال میں ہزارہا سوداگر اپنے ذاتی اعتبار پر تجارتی اشیاء خرید کرتے اور اُن کی فروخت سے نفع اُٹھاتے ہیں۔ علی ہذا القیاس زمانۂ حال کی تجارت کا بہت بڑا حصہ حقوقِ نالش اور دیگر حقوق مثلاً حقِ تصنیف وغیرہ کی خرید و فروخت کے متعلق ہے۔

دنیا میں بہت سے ملک ہیں۔ جنکو قدرت نے صنعت حرفت اور دستکاری کے دیگر اقسام کے لئے نہایت موزوں پیدا کیا ہے۔ لیکن سرمائے کی کمی یا عدم موجودگی کے باعث اُن کی تجارت چمک نہیں سکتی۔ ہمارے ہندوستان کو بھی اِس مصیبت کا سامنا ہے۔ یہاں کی تجارت بیشتر مغربی سوداگروں کے ہاتھوں میں ہے۔ جو اپنے سرمایہ کو ہندوستانی تجارت کی مختلف شاخوں میں لگا کر نفع عظیم حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے۔ کہ غیر ملکی سوداگروں کا ہمارے ملک میں سرمایہ لگانا ہمارے لئے مضر ہے۔ اِس میں کچھ شک نہیں۔ کہ اگر سرمایہ ہمارا اپنا ہوتا۔ تو نفع جو اس سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جو موجودہ صورت میں غیر ملکی سوداگروں کے ہاتھوں میں جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں ہی رہتا۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ ان مغربی سوداگروں کے سرمائے کی وساطت سے بالخصوص نیل۔ غلہ۔ شکر۔ کافی اور سونے کی پیدائش کے وسائل پہلے کی نسبت بہت ترقی کر گئے ہیں۔ یا یوں کہو۔ کہ اُن لوگوں نے اپنی سرگرمی اور ہمت سے ہماری سرزمین کے مخفی خزانوں کے دروازے کھولکر ہمارے لئے آئندہ تجارت

کی راہیں کھولدی ہیں۔ بشرطیکہ ہمارے پاس سرمایہ موجود ہو۔ اِس بیان سے ظاہر ہے۔ کہ سرمایہ کسی ملک کے وسائلِ پیدائش کی ترقی۔ دستکاری اور تجارت کی مختلف شاخوں کے قیام کے لئے کہاں تک ضروری ہے۔ لہذا ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے۔ کہ وہ کون کون سے اسباب ہیں۔ جن سے یہ زیادہ ہو سکتا ہے۔

(۱) یہ بیان ہو چکا ہے۔ کہ سرمایہ بچت کا نتیجہ ہے۔ اور سرمایہ دار کی کفایت شعاری پر دلالت کرتا ہے۔ لہذا تعلیم یا دیگر حالات جو کسی ملک کے لوگوں کو کفائت شعار بنانے کے ہیں۔ سرمائے کی زیادتی کا پہلا سبب ہیں۔ دولت بچانے کی خواہش لوگوں کے حقوق کی حفاظت اور شرح سود کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔ البتہ جو قومیں سود لینا خلافِ مذہب تصور کرتی ہیں۔ ان پر یہ محرک اثر نہیں کر سکتا۔

(۲) پیداوار دولت کی مقدار کے زیادہ ہونے سے بھی سرمایہ کی مقدار بڑھتی ہے۔ اگر کسی ملک میں چالیس ہزار من غلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اس میں سے دس ہزار من بطورِ سرمایہ جمع کر لیا جاتا ہے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ ساٹھ ہزار من غلہ پیدا ہونے کی صورت میں زیادہ مقدار بطورِ سرمایہ جمع ہونی ممکن ہو سکیگی۔

(۳) تجارت اور تبادلے سے بھی سرمائے کی مقدار بڑھتی ہے۔ کیونکہ ان دونوں صورتوں میں پیداوار دولت کی مقدار بڑھتی ہے۔ جس سے (دیکھو مسئلہ نمبر ۲) سرمائے کی مقدار میں زیادتی ہوتی ہے۔

باب چہارم

کسی قوم کی قابلیت پیدائش دولت کے لحاظ سے

پیدائش دولت کے لحاظ سے کسی قوم کی قابلیت اس قوم کی زمین محنت اور سرمائے کے حسن استعمال اور ان کے مفید طریقوں میں صرف ہونے پر انحصار رکھتی ہے۔ خواہ زمین کی کاشت نقطۂ تقلیل نہ پہنچی ہو۔ خواہ پہنچ گئی ہو۔ محنتی کی ہنرمندی ذہانت فن زراعت کی ترقی تعلیم محنت سرمائے کو زیادہ دور اندیشی سے نئی نئی مفید صورتوں میں صرف کرنے اور اسی قسم کے دیگر اسباب سے دولت کی پیداوار انتہا درجہ کی ترقی کرتی ہے۔ یہاں ایک بڑا ضروری اور اہم اقتصادی سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ پیداوار دولت زمین محنت اور سرمائے کی قوت پیداوار سے متعین ہوتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ کوئی قوم اس قدر دولت پیدا نہیں کر سکتی جو اس کے وسائل پیدائش کے مطابق ہو؟ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ وسائل پیدائش میں خواہ کسی قدر قوت ہو دولت کی پیداوار اس قوت کے لحاظ سے کم رہتی ہے یعنی اس قدر پیدا نہیں ہوتی جس قدر کہ ہونی چاہیے۔ اس اختلاف کا باعث کیا ہے؟

اس سوال کا جواب علم الاقتصاد کے تمام حصص کے مطالعہ کے بغیر محال ہے۔ دولت کے صرف یا استعمال کے بیان میں تمہیں معلوم

ہوگا کہ بعض دفعہ دولت کا استعمال قوم کی قوت سرمایہ اور محنت کو انتہا درجے کا نقصان پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح تقسیم دولت کے بیان میں تم معلوم کرو گے کہ بعض دفعہ دولت اپنے پیدا کنندوں کے درمیان ایسے بے اصول طور پر تقسیم ہوتی ہے کہ بعض افراد کو ایک مستقل نقصان پہنچ جاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس تبادلے کے باب میں اس امر کے اسباب واضح ہوں گے کہ بعض دفعہ پیدائش دولت کیوں رک جاتی ہے یا دستکاری کی چلتی گاڑی میں کیوں روڑا اٹک جاتا ہے جس سے پچھلے سالوں کی پیدا کردہ دولت ان بے کاری کے دنوں میں صرف ہو جاتی ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا سوال کا شافی جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک تم علم اقتصاد کے تمام حصص کا غور سے مطالعہ نہ کر لو۔ یہاں ہم صرف اُن اسباب کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو پیدائش دولت کے سد راہ ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس امر کا ایک سبب تو یہ ہے کہ قدرتی طور پر زمین کی زرخیزی (بشرطیکہ انسان اپنی عقلمندی کے زور سے قانون تقلیل حاصل کے اثر کا مقابلہ نہ کرتا رہے) دن بدن کمی کی طرف میلان رکھتی ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

(۱) محنت اور سرمایہ کسی حد تک ناقابل انتقال ہیں۔ تمام مہذب قوموں میں محنت اور سرمایہ دونوں کچھ اس طرح خاص خاص صورتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ کہ اگر ان کو ایک صورت سے دوسری صورت میں منتقل کرنا چاہیں تو کئی قسم کی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ مثلاً جس تاجر نے لاکھوں روپیہ کی رقم کلوں پر صرف کر دی اس کے واسطے یہ امر کس طرح ممکن ہے کہ اپنا کثیر سرمایہ بغیر خرچ اور دیگر نقصان کی کسی اور صورت میں منتقل کر دے یا جس دستکار نے ایک خاص پیشہ

بڑی جانفشانی اور روپیہ خرچ کر کے سیکھا ہے۔ اِس کے واسطے کس طرح ممکن ہے کہ اُس پیشے کو چھوڑ کر کسی اور پیشے کو اپنا ذریعۂ معاش بنائے؟

•(۲) محنت اور سرمایہ کا ناعاقبت اندیشی سے استعمال کیا جانا۔

اگر ان ہر دو وسائل کو دور اندیشی سے استعمال نہ کیا جائے تو ان کی قوت پیدائش میں ایک نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کارخانے کے مالک کی وفات پر اسکا جانشین اپنی خامی اور ناتجربہ کاری کے باعث دور اندیشی سے کام نہ لے اور اسطرح اس کی بدانتظامی کی وجہ سے وسائل کی قوت پیدائش میں ایک معتدبہ کمی پیدا ہو جائے۔ تم کو معلوم ہے کہ موجودہ زمانے میں ضروریات کے تقاضے سے تمام مہذب ملکوں میں محنت اور سرمائے کا انتظام افراد کی ایک خاص جماعت کے ہاتھوں میں ہے جسکو جماعت مالکاں یا کارخانہ داراں کہتے ہیں۔ اِس جماعت کا وجود سرمائے اور محنت کے مفید انتظام کے لئے ایسا ہی ضروری ہے۔ جیسے فوج کے لئے اعلیٰ افسروں کا وجود۔ جسقدر اصولِ انقسام محنت پر زیادہ عمل ہوتا جاتا ہے اُسی قدر مالک یا کارخاندار کا وجود نہ صرف تنظیمِ محنت اور دستکاری کو مفید راہوں میں لگانے کے لئے بلکہ دستکاروں کے درمیان حسنِ انتظام قائم رکھنے کے لئے زیادہ ضروری ہوتا جاتا ہے۔ مالک کے سوائے اِس امر کا فیصلہ کون کرسکتا ہے کہ کون سی شے تیار کی جائے گی اور کس قیمت پر فروخت کی جائے گی؟ غرض کہ دنیا کی موجودہ دستکاری اِس بات کی طرف میلان رکھتی ہے کہ اسکا انتظام دن بدن ایک خاص جماعت افراد کے ہاتھوں میں آتا جائے۔

بعض ماہرین علم اقتصاد کی رائے ہے کہ پیدائش دولت کے نظام میں

مالک یا کارخاندار کا وجود ضروری نہیں ہے بلکہ ان حکماء کے خیال میں اس کی موجودگی دستکاروں اور کارخانہ داروں کے درمیان ایک قسم کی بیجا تجاتی رقابت پیدا کر دیتی ہے جسکے نتائج پیدائش دولت کے حق میں مضرت رسان ہوتے ہیں۔ اس دقت کے رفع کرنے کی کئی راہیں بتائی گئی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ ایک ہی پیشے کے دستکار مشترک سرمائے سے ملکر کام کیا کریں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس قسم کی باہمی معاونت کئی حیثیتوں سے مفید ہے۔ مثلاً اگر یہ معرض عمل میں لایا جاوے تو۔

(۱) دولت کی وہ مقدار جو موجودہ اقتصادی حالت میں مالک کی جیب میں جاتی ہے۔ دستکاروں کے قبضے میں آنے گی۔

(۲) دستکار ہر طرح سے خود مختار ہوگا۔ اور دولت کی جو صورت چاہیگا پیدا کرے گا۔

(۳) موجودہ حالات تمدن میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دستکار مالکوں سے زیادہ اجرت لینے پر ضد کرتے ہیں اور اگر ان کو اجرت کی مطلوبہ مقدار نہ ملے تو کام کاج چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن اگر اس طریق کو عمل میں لایا جاوے تو ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ کیونکہ جس فریق سے ضد پیدا ہو جانے کا امکان ہے وہ فریق ہی نہ رہیگا۔

(۴) دستکار کو کفایت شعاری کی تحریک ہوگی۔ اور اپنا کام تن دہی سے کرے گا۔

یہ طریق معاونت عموماً دو صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔

(اول) وہ صورت جس میں دستکار متحد ہو کر کسی خاص تجارتی شاخ میں آمدنی پیدا کرنے کی غرض سے کام کریں۔

(دوم) وہ صورت جس میں دستکار اپنی حاصل کردہ دولت باحسن وجوہ صرف کرسکیں۔ مثلاً چند دستکار ملکر کھانے پینے کی چیزوں کی ایک دکان کھولیں اور آپس میں یہ عہد کرلیں کہ وہ اپنی ضرورت کی چیزیں معمولی منافع پر اسی دکان سے خرید کیا کرینگے۔ اس طریق سے ایک تو یہ فائدہ ہوگا کہ ضرورت کی چیزیں کسی قدر سستی مل جایا کرینگی اور علاوہ اس کے مصارف دکان وغیرہ نکالکر جو سال بھر کے بعد منافع ہوگا۔ وہ سب دستکاروں پر ہر ایک کے حصہ کے مطابق تقسیم ہوجایا کریگا۔ مقدم الذکر صورت میں کچھ بہت بڑی کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ دستکار جمع ہوکر وہ تجارتی قابلیت نہیں دکھاتے جو کارخانداروں میں بالخصوص پائی جاتی ہے۔ اُن میں سے اکثر صرف کل کی طرح کام کرنا جانتے ہیں۔ اور اس تجارتی مذاق سے قطعاً معرا ہوتے ہیں۔ جسکے ذریعے سے کارخانہ دار تجارت کے جذر و مد کو ایک نگاہ سے معلوم کرلیتے ہیں۔ البتہ مؤخر الذکر میں کامیابی کی امید ہوسکتی ہے خصوصاً ہندوستان میں جہاں اس قسم کے اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔

(سوم) اس مختصر سی گریز کے بعد جاننا چاہیئے کہ پیدائش دولت کا تیسرا مانع بعض قدرتی حوادث سے دولت کا برباد ہوجانا ہے۔ مثلاً آندھی کے طوفان سے جہازوں کی تباہی آتش زدگی اور ریل کے دیگر حادثات وغیرہ

اس باب کے ضمن میں ایک اور ضروری مسئلے کی تحقیق بھی لازم ہے تم جانتے ہو کہ مختلف ممالک میں پیداوار دولت کی مقدار مختلف ہوتی ہے۔ بلکہ اگر ایک ہی ملک کی تاریخ پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ مختلف زمانوں

میں اس ملک کی پیداوار دولت کی مقدار مختلف رہی ہے۔ بسا اوقات دو ملک تہذیب و تمدن کے ایک ہی درجے پر ہوتے ہیں۔ اور اُن کے دیگر حالات بھی قریباً قریباً یکساں ہوتے ہیں تاہم مذکورہ بالا اختلاف اس صورت میں بھی موجود ہوتا ہے۔ اِس واقعہ پر غور کرنے سے دو ضروری سوال پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) وہ کون سے اسباب ہیں جن سے یہ اختلاف پیدا ہوتا ہے۔

(۲) یہ اسباب کون سے اقتصادی قوانین کے تابع ہو کر عمل کرتے ہیں؟۔

پیدائش دولت ایک پیچیدہ عمل ہے جسکے بالعموم تین مدارج ہو سکتے ہیں۔

(ا) وہ محنت جو کسی مادی شے پر قبضہ حاصل کرنے میں عارض ہوتی ہے، مثلاً جنگل سے درختوں کا کاٹنا۔

(ب) وہ محنت جو اُس قدرتی شے میں ایسے تغیرات پیدا کرنے پر صرف ہوتی ہے جو اسکو انسانی استعمال کے قابل کر دیتے ہیں مثلاً لکڑی کی چوکیاں تیار کرنا۔

(ج) وہ محنت جو مصنوعات کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جانے میں صرف ہوتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جس ملک میں محنت نسبتاً زیادہ مساعد حالات میں صرف کی جائیگی یا جہاں محنتیوں کی تعداد یا ان کی محنت کی کارکردگی زیادہ ہو گی وہاں پیدائش دولت کا عمل نہایت نتیجہ خیز ہوگا۔ مختلف ممالک کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) بعض ممالک میں محنت کے واسطے حالات نسبتاً زیادہ مساعد ہوتے ہیں مثلاً کہیں قدرت نے اپنی فیاضی سے کوئلے کی وسیع کانیں رکھدی ہیں۔ اور کہیں مفید دھاتوں کے بیش بہا خزانے زمین کے اندر پوشیدہ کر دئیے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس بعض ممالک میں کئی اشیا قدرتی پیدا ہوتی ہیں۔ حالانکہ دیگر ممالک انہیں اشیاء کو محنتِ شاقہ سے حاصل کرتے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس قسم کے فوائد ہمیشہ یکساں نہیں رہتے (پہلے) کے زمانے میں دریاؤں کا ایک فائدہ اور فائدوں کے علاوہ یہ بھی تھا کہ مختلف شہروں اور قصبوں میں تجارتی اور دیگر تعلقات کا سلسلہ انہیں کی وساطت سے جاری تھا ہمارے زمانے میں یہ سب کام ریل گاڑی کی وساطت سے سرانجام پاتے ہیں۔ مزید براں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ قدرت کے مختفی خزانوں سے ہم صرف اُسی صورت میں مستفید ہو سکتے ہیں کہ ہمکو اُنکا علم ہو۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اشیاء مادیہ کے مخفی خواص اور زمین کے پوشیدہ اسرار روز بروز زیادہ معلوم ہوتے جاتے ہیں۔ اور انسان اُن سے مستفید ہو کر بے انتہا فائدہ اُٹھاتا جاتا ہے جن قوموں کو یہ علم نہیں ضرور ہے کہ وہ پیدائشِ دولت میں اُن اقوام سے پیچھے ہوں جنکو ان اسرار کا علم ہے معدنیات کو ہی لو جس ملک کے لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ معدنیات کس طرح دریافت ہوا کرتی ہیں ان کو کچھ فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ خواہ ان کے ملک کی زمین قیمتی دھاتوں کے خزانوں سے معمور ہو۔

(۲) بعض ممالک میں دستکاروں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے جو پیدائش دولت پر ایک نمایاں اثر ڈالتی ہے۔ ہمارے ہندوستان کے دستکاروں

کی تعداد کثیر ہے صرف سرمائے کی کسر ہے ورنہ پیدائش دولت میں ہم اور قوموں سے اس قدر پیچھے نہ ہوتے۔ کمیت کے علاوہ مختلف ممالک کے دستکاروں کی محنت کی کیفیت بھی مختلف ہوتی ہے۔ بعض ممالک کے دستکاروں کی عادات جبلی طور پر قوانین صحت کی خلاف ہوتی ہیں کہیں پانی اور صاف ہوا دستیاب نہیں ہوسکتی۔ کہیں اور اس قسم کے طبعی اسباب ہوتے ہیں جن سے دستکاری کی کیفیت پر اثر پڑتا ہے۔ علیٰ ہذاالقیاس جسمانی قوت کے اختلاف کے علاوہ مختلف مقامات کے دستکاروں کے ہنر سمجھ اور دوراندیشی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ بعض اقوام قدرتًا دیگر اقوام کی نسبت زیادہ ذکی اور چست ہوتی ہیں بعض قدرتًا سست اور آرام طلب۔ اس قسم کے نقائص کا دور کرنا ملک کے مصلحوں اور معلموں کا فرض ہے۔

(۳) محنت کے محرکات میں بھی بالعموم اختلاف ہوتا ہے۔ فطرتًا ہر انسان دولت کا خواہش مند ہے۔ اور یہ فطری خواہش محنت کا سب سے بڑا محرک ہے لیکن بعض اوقات دیگر محرکات زیادہ زبردست ثابت ہوتے ہیں اور دولت کی خواہش کو انسان کی زندگی پر پورا پورا اثر کرنے سے روکتے ہیں بعض مذاہب میں دولت کی تحقیر ایک مسلم اصول ہے جو ضرور ہے کہ ان مذاہب کے مخلص پیرؤں پر اپنا اثر کرے بالعموم مشرقی اقوام کے لوگ تقدیر کے اس قدر قائل ہیں کہ کل کی فکر کرنا جانتے ہی نہیں اور توکل کے بھروسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہاں یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ دولت کی خواہش ایک خاص حد تک ہی محرکِ محنت ہوسکتی ہے کیونکہ محنت سے اصل مدعا یہی ہوتا ہے کہ تمام ضروریات پوری ہوجائیں۔ جب تمام ضروریات پوری ہوگئیں تو پھر یہ محرک اپنا عمل نہیں کرسکتا۔ اسکا جواب یہ ہے کہ جب انسان کی

ضروری حاجات پوری ہو جاتی ہیں تو قدرتاً جدید ضروریات پیدا ہو جاتی ہیں
مثلاً مکان کو آراستہ کرنے اور دیگر آسائش کے سامان کی خواہش۔ علم ادب
اور دیگر علمی مشاغل سے لذت اٹھانے کی خواہش بھی اسی ضمن میں شامل ہے۔
یہ محرکات ثانی ہیں جو مختلف اقوام کی حالت میں اور تہذیب و تمدن کے مختلف
مدارج میں مختلف طور پر اپنا اثر کرتے ہیں۔ ذاتی ضروریات کے پورا ہونے
پر قدرتاً ہر انسان کو اولاد کے لئے کچھ نہ کچھ پیچھے چھوڑ جانے کا بھی خیال پیدا
ہوتا ہے جو محنت کا ایک مزید محرک ہے۔

(۴) مختلف ممالک کے دستکاروں کے اخلاقی حالات مختلف
ہوتے ہیں۔ دستکار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دیانت دار ہو کام
چور نہ ہو۔ اور اپنی طبیعت کے غیر نافع جذبات پر قدرت رکھتا ہو۔ جسقدر
عاقبت اندیشی اور دیانت داری اس میں ہوگی جسقدر اپنے مقررہ فرض
کے انجام دہی کا خیال اُس میں ہو گا اسی قدر اسکی محنت قومی دولت کو زیادہ
کرے گی۔ سست اور آرام طلب دستکار اپنے ملک اور قوم کے لئے ایک
مضرت رساں وجود ہے۔ کیونکہ اسکا وجود قوم کی دولت کو دن بدن گھٹاتا ہے۔
تعلیم و تربیت کا سب سے ضروری فرض یہی ہے کہ عوام میں دیانت داری
چستی عاقبت اندیشی اور دیگر ضروری اوصاف پیدا ہوں اور ان کے دلوں
پر یہ بات نقش ہو جائے کہ تمام قوم کا فائدہ بحیثیت مجموعی اور کسی خاص
فرد قوم کا فائدہ متغایر چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے وابستہ
ہیں۔ اور جو دستکار اپنے حیوانی جذبات کی پیروی کر کے اپنے جسمانی
اور روحانی قوا کو نقصان پہنچاتا ہے وہ نہ صرف اپنی ذات پر بلکہ
اپنے ملک اور قوم پر بھی ظلم کرتا ہے۔

(۵) مختلف ممالک میں دستکاروں کی محنت کی کارکردگی مختلف ہوتی ہے اور اکثر ممالک میں اس کارکردگی کو زیادہ کرنے اور سرمائے کے زیادہ دوراندیشی سے استعمال کئے جانے کے وسائل اختیار کئے گئے ہیں۔ کہیں طریقِ اشتراک مروج ہے۔ کہیں طریقِ معاونت (جسکا ذکر پہلے ہو چکا ہے) سے کام لیا جاتا ہے۔ اور کہیں دیگر اقسام کے تجارتی اتحاد پر عمل کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہندوستان میں بھی طریقِ اشتراک یعنی مشترک سرمائے سے کام کرنا اب مروج ہوتا جاتا ہے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ طریق اِن ممالک کے لئے نہایت مفید ہے جہاں مجموعی طور پر سرمائے کی مقدار کم ہو۔ اگر کوئی شخص سو روپیہ سرمائے کے ساتھ کوئی تجارت شروع کرے تو اسکو کچھ بہت منافع کی توقع نہ ہوگی۔ لیکن اگر سو سو روپیہ سرمائے والے بیس آدمی ملکر کام شروع کریں تو بہت زیادہ منافع کی امید ہوگی۔ یہ اسبابِ اختلاف مختلف ممالک میں یا تو حقیقۃً موجود ہیں اور اپنا عمل کر رہے ہیں۔ یا حقیقۃً موجود تو ہیں لیکن ان کا اثر دیگر اسباب کے عمل سے زائل ہو رہا ہے۔

ہم نے اپنے پہلے سوال کا جواب دیدیا ہے۔ اب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مندرجہ بالا اسبابِ اختلاف کون سے اقتصادی قوانین کی تابع ہو کر عمل کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اِن اسباب میں سے بعض مثلاً سبب نمبر ۱ کا عمل کسی قانونِ کلیہ کے تابع نہیں ہے۔ تاہم بعض کا عمل قوانین کی تابع ہے۔ مثلاً دستکاروں کی تعداد اور اس کے متعلقہ اسباب کا عمل قانونِ کلیہ آبادی کی تحت میں ہے۔ اور علیٰ ہذا القیاس محنت کی کارکردگی وغیرہ کا عمل قانونِ سرمایہ کے احاطہ اثر میں داخل ہے۔ ماہرین علم الاقتصاد نے

اس بارے میں تین کلیہ قوانین دریافت کئے ہیں جنکو ہم سلسلہ وار بیان کرتے ہیں۔

(۱) **قانون آبادی** - اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی قوم کے افراد کے زیادہ ہونے سے اس قوم کے دستکاروں کی تعداد بڑہتی ہے۔ مگر اسوقت یہ امر محل بحث نہیں ہے۔ ہم قانون آبادی پر اس تعلق کے لحاظ سے نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں جو افزائش افراد اور پیداوار دولت کے درمیان ہے محققین کہتے ہیں کہ یہ قانون تین قضایا پر منقسم ہوسکتا ہے۔

اول یہ کہ آبادی ہمیشہ بڑہنے کا میلان رکھتی ہے۔ اور اس کی افزائش اس امر کا خیال نہیں کرتی کہ آیا مزید آبادی کے گذارہ کے لئے کافی سامان معیشت موجود ہوگا یا نہیں۔ بعض حکماء نے تخمینہ لگایا ہے کہ اگر بڑے بڑے قحط اور وبائیں نہ آئیں تو آبادی تیس سال میں دگنی ہوجائیگی۔

دوم اگر زمین کے کسی قطعہ میں آبادی اسطرح دگنی ہوتی جائے اور دیگر اسباب اسکی افزائش کی راہ میں حائل نہوں مثلاً وبا قحط جنگ اور شادیوں کی کمی وغیرہ تو ایک خاص میعاد کے بعد قطعہ مذکور کی پیداوار وہاں کے آدمیوں کے لئے مشکل سے کافی ہوگی اور بالآخر مطلق کفایت نہ کریگی یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ آبادی کی مفروضہ افزائش کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکیگا۔

سوم ہمارا گذشتہ تجربہ جو ہمکو صنعت و حرفت کی ترقی کا مشاہدہ کرنے سے حاصل ہوا ہے اس امر کی تصدیق نہیں کرسکتا کہ فن زراعت کی آئندہ ترقی سے ہم اپنی آبادی کی مفروضہ افزائش کے مطابق خوراک کی زیادہ مقدار پیدا کرسکینگے۔

قضیہ نمبر ۲ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون تقلیل حاصل بھی جسکا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں قانون آبادی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اور

اِن دونوں کے اجتماع سے یہ نتیجہ قائم ہوتا ہے کہ آبادی کے ایک خاص حد تک بڑھ جانے کے بعد زرعی دستکاروں کی مزید آبادی سے محنت کی قابلیت پیداوار کم ہوتے جانیکا میلان رکھتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جسقدر آبادی زیادہ ہوگی اور ایک حدِ معین سے بڑھتی جائیگی (یہ حدِ معین مختلف ممالک کی صورت میں مختلف ہوسکتی ہے۔ کیونکہ مختلف اقوام و ممالک میں صنعت و حرفت و فنِ زراعت اور دیگر ایجادات کی ترقی کے مدارج مختلف ہیں مثلاً ممکن ہے کہ ایک چھوٹا سا ملک اپنے ایجادات زرعی کے بل پر ۲۰ کروڑ آبادی کا متحمل ہوسکے اور ایک اور ملک جو اس سے وسعت میں بہت زیادہ ہو لیکن ایجادات میں کم ہو اُس سے آدھی آبادی کا بھی متحمل نہ ہوسکے) اِسی قدر زمین مزروعہ کی کاشت نقطۂ متقلیل تک جلد پونچیگی جسکا نتیجہ جو کچھ پیداوار دولت پر ہوگا ظاہر ہے۔

(۲) محنت کی کارکردگی کے اختلافات اور ان کے اثر کے متعلق کوئی کلیہ قانون وضع نہیں ہوسکتا کیونکہ دستکاروں کے طبعی عقلی اور اخلاقی اوصاف کے فرق بیان کرنے اور ان کے محرکاتِ محنت کی تشریح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم کو تہذیب و تمدن کے خفی در خفی اسباب کا پورا پورا علم ہو جو موجودہ صورت میں ناممکن ہے لہذا ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مختلف ممالک کے درمیان مختلف افراد کے ذاتی سرمائے کی افزائش جس پر پیداوار دولت کا ایک حد تک انحصار ہے کس قانون کی تحت میں ہے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ قانون افزائش سرمایۂ شخصی کیا ہے؟ اس امر کے متعلق جتنی مِل ایک قانون وضع کرتا ہے کہ سرمایہ جمع کرنے کی خواہش شرح سود کے ساتھ نسبت مستقیم رکھتی ہے جس ملک میں، شرح سود زیادہ ہوگی وہاں کے لوگوں کو روپیہ جمع کرنے کی تحریک زیادہ ہوگی

اور جہاں شرح سود کم ہوگی وہاں جمع کی تحریک مطلق نہ ہوگی یا نہایت کم ہوگی مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ اِن کا یہ قانون کامل طور پر صحیح نہیں ہے کیونکہ جمع کرنے کی تحریک صرف شرح سود کی مقدار سے ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے اور بھی کئی ایک اسباب ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ شرح سود کے کم ہو جانے سے جمع کرنے کی تحریک زیادہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ شرح مذکور کی کمی کی صورت میں ضروری ہے کہ زیادہ رقم بطور سود لینے کی غرض سے زیادہ سرمایہ دیا جائے جسکا پہلے جمع ہونا لازم ہے۔

(۳) قانون سرمایۂ شخصی تو کسی قدر وضاحت سے بیان ہو سکتا ہے لیکن قانون سرمایۂ قومی (سرمایۂ قومی سے مراد پیدائشِ دولت کے وہ وسائل ہیں جو کسی قوم کی گذشتہ محنت سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً پرانے تعمیر شدہ مکانات سڑکیں وغیرہ) کا وضاحت کے ساتھ بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ کسی فرد واحد کی نسبت تو ہم کسی قدر رائے لگا سکتے ہیں کہ اسکا سرمایہ کس اصول کے مطابق کم و بیش ہوتا ہے مگر کسی قوم کے سرمائے کی نسبت بحیثیت مجموعی اس قسم کا قانون وضع کرنا نہایت دشوار ہے۔ ظاہر ہے کہ سرمایۂ قومی کی زیادتی سے محنت کی مانگ یا یوں کہو کہ اجرت کی مقدار بڑھتی ہے اور اس طرح مختلف ممالک کی پیداوار دولت میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ سرمایۂ مذکور کا اصل اصول کیا ہے۔ اگر کسی طرح سے کوئی اصول معلوم بھی ہو جائے تو اُس سے صحیح نتائج مستخرج نہیں ہو سکتے کیونکہ بسا اوقات اور بالخصوص زمانۂ حال میں اکثر قومیں اپنا سرمایہ خود نہیں استعمال کرتیں۔ بلکہ دیگر اقوام کو مستعار دیدیتی ہیں۔ اگرچہ سرمائے کو اس طرح مستعار دیدینے سے اُن اقوام کو دنیا کی پیداوار محنت میں زیادہ حصہ ملتا ہے۔

لیکن اس سے اُن قوموں کی ذاتی محنت کی قابلیت پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ اُن کی تجارتِ خارجی کے فوائد میں کسی قدر زیادتی ضرور ہوجاتی ہے۔ مزید براں اکثر اوقات بعض ممالک کے ارکان سلطنت جنگ وغیرہ کے اغراض کے لئے قوم سے قرض اُٹھاتے ہیں جس سے قومی سرمائے میں کمی عارض ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس رفاہِ عام مثلاً تعلیم وحفظانِ صحت وغیرہ کے کاموں پر جو محنت صرف ہوتی ہے اس سے کسی خاص فرد کو کوئی نفع نہیں ہوتا بلکہ اُسکا فائدہ عام بالخصوصیت ہوتا ہے۔ نیز وہ محنت جو اکثر افراد حب وطن کے خیال سے نظامِ سلطنت کی حفاظت اور اسکی اندرونی قوت کو برقرار رکھنے کے لئے کرتے ہیں اکثر مالی فائدہ کی آمیزش سے مبرا ہوتی ہے۔ غرض کہ ان وجوہ سے کسی ملک کے سرمایۂ قومی کی کمی بیشی کا کوئی وسیع اور کامل اصول قائم کرنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

حصّۂ سوم

تبادلۂ دولت

باب اوّل - مسئلۂ قدر

بعض مصنفین کہتے ہیں کہ تبادلۂ دولت علم الاقتصاد کا کوئی خاص حصہ نہیں ہے۔ مگر یہ رائے تجارت اور تبادلے میں امتیاز نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ علاوہ اِس کے منطقی وضاحت اِس امر کی مقتضی ہے کہ اِس مضمون کو علم الاقتصاد کا ایک علیحدہ حصہ سمجھا جائے تاکہ مختلف اقتصادی مسائل آپس میں مخلوط نہ ہو جائیں۔ اِس حصہ کا مقصد تناسب تبادلہ یا ان شرائط پر بحث کرنا ہے جنکے رو سے ایسی اشیاء کا باہمی تبادلہ ہوتا ہے جو ایک معین قدر رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب دو چیزوں کا تبادلہ کیا جاتا ہے تو ایک شے کی ایک خاص معین مقدار دوسری شے کی ایک خاص معین مقدار کے عوض میں دی جاتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مقدار معین کیوں ہوتی ہے کم و بیش کیوں نہیں ہوتی؟ علم الاقتصاد کے اِس حصے کا مقصد اِسی سوال کا جواب دینا ہے۔

تبادلہ انقسام محنت سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہر شخص اپنی اپنی ضرورت کی چیزیں پیدا کرنے میں مصروف ہوتا تو تبادلے کی ضرورت کبھی لاحق نہ ہوتی۔

لیکن جب اِن کے مشاغل میں اختلاف پیدا ہوتا ہے یا یوں کہو کہ مختلف انسان یا اقوام دولت کی مختلف صورتوں کے پیدا کرنے میں مصروف ہوتی ہیں تو تبادلے کا دستور خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ مختصر طور پر یوں کہو کہ تبادلہ اتحاد کی ایک صورت ہے جو اختلافِ مشاغل سے پیدا ہوتی ہے۔ جب ایک شخص غلہ پیدا کرتا ہے دوسرا مکئی یا آلو اور تیسرا کپڑا تیار کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ ضرورت اِن سب کو باہمی تبادلے پر مجبور کرے گی۔ اسوقت یہ سوال پیدا ہوگا کہ غلہ کی کسقدر مقدار دس گز کپڑے یا دو من آلو کے عوض میں دی جائے گی؟ جسقدر اصولِ انقسام محنت کا عمل وسیع ہوتا جائے گا اس قدر تبادلے کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جائیگا لیکن چونکہ ایسی صورت میں افراد کو اپنی اپنی ضرورت کی اشیاء کا باہمی تبادلہ کرنے میں دقت ہوگی یا کم از کم ان کے وقت کا کچھ حصہ اِس تبادلے میں ضائع ہوگا۔ اسواسطے قدرتاً تبادلے کا کام افراد کی ایک خاص جماعت کے زیر اہتمام آتا جائیگا جسکو علم الاقتصاد کی اصطلاح میں افراد تبادلہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنکی وساطت سے تجارتِ عالم کی گاڑی چلتی ہے اور دور دراز ممالک کے باشندوں کے درمیان رابطۂ اتحاد پیدا ہوتا ہے اور تبادلۂ اشیاء کے ساتھ تبادلۂ خیالات بھی ہوتا رہتا ہے۔

غرض ہمارا مقصد اِس حصے میں یہ معلوم کرنا ہے کہ تبادلے میں اشیاء خاص خاص مقادیر کن اصولوں کے لحاظ سے متعین ہوتی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہندوستانی غلے کی ایک خاص مقدار کے عوض میں چینی چاء کی ایک خاص مقدار یا جاپانی چھاتوں کی ایک خاص تعداد دی جاوے؟ یہ مقدار یا یہ تعداد کم و بیش کیوں نہ ہو؟ مختصراً اشیاء میں قوتِ تبادلہ کن کن شرائط سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے اسباب و وجوہ کیا کیا ہیں؟ قدر کی تعریف اس کتاب

کے پہلے حصہ میں لکھی جا چکی ہے یعنی قدر قوت تبادلہ کا نام ہے یا اس قدر یا قوت کا نام ہے جو کسی شے کی وساطت سے اس شے کے قابض کو حاصل رہتی ہے اور جسکو تبادلے میں دے کر وہ شخص بلا لحاظ جبر و اکراہ یا تاثرات ذاتی اوروں کی پیداوار محنت کو حاصل کر سکتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیوں ایک شے اپنے قابض کو یہ قدرت یا قوت دیتی ہے اور دوسری نہیں دیتی؟ کیوں ایک شے کے قبضہ سے اوروں کی پیداوار محنت پر حصول مہینوں بلکہ برسوں تک یہ قدرت حاصل رہتی ہے اور دوسری شے کے قبضہ سے یہ قدرت مطلق حاصل نہیں ہوتی یا اگر ہوتی ہے تو نہایت قلیل عرصے کے لئے؟ یہ سوال علم الاقتصاد کے نہایت ضروری سوالوں میں سے ہے لہذا طالب علم کو ضرور ہے کہ اس کے ہر پہلو پر سوچ کر اسکو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لے۔

ظاہر ہے کہ تبادلے کے لئے کم از کم دو اشیاء کا ہونا لازم ہے جب ہم کہتے ہیں کہ کسی شے کا تبادلہ ہو سکتا ہے تو ہمارا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اسکا تبادلہ کسی اور شے کے ساتھ ہو سکتا ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شے کی قدر تبادلے میں اتنی ہے تو بالواسطہ یا بلا واسطہ ہم کسی اور شے یا اشیاء کی قدر کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کے عوض میں شے مذکور دی جا سکتی ہے۔ عام طور پر وہ دوسری شے جس کے عوض میں کوئی شے دی جا سکے زر نقد ہے جسکو دنیا کی مہذب اقوام نے اشیاء کی قدر کا پیمانہ قرار دیا ہے۔ پس کسی شے کی قدر سے حقیقت میں مراد اس کی قیمت سے یا زر نقد کی اس مقدار سے ہے جو اس شے کے عوض میں دی جائے۔ اس مقام پر قدر اور قیمت کا ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے لہذا ہم اسے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس ۴ من غلہ ہے جسکے عوض میں وہ ۲ من کوئلہ لے سکتا ہے۔ اس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ ۴ من غلے کی قدر

اُن کوئلوں کی قدر کے برابر ہے۔ اِس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ قدر کے مفہوم میں اشیاء کا مقابلہ داخل ہے اور قدر ایک اضافی اصطلاح ہے۔ ایک شے کی قدر دو طرح سے کم و بیش ہو سکتی ہے یا تو اس کی ذاتی قدر میں کمی بیشی ہونے سے یا دیگر اشیاء کی قدر میں تغیر پیدا ہو جانے سے پس معلوم ہوا کہ تمام اشیاء کی قدر ایک ہی وقت میں نہیں بڑھ سکتی کیونکہ ایک شے کی قدر کی زیادتی اور دوسرے کی قدر کی کمی لازم ملزوم ہیں۔ یہ کہنا کہ ایک ہی وقت میں اشیاء کی قدر کم و بیش ہو سکتی ہے۔ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ چھ شخصوں میں سے ہر ایک اپنے باقی پانچ ہمراہیوں کی نسبت زیادہ تیز رفتار ہے۔ الغرض کسی شے کی قیمت اس کی قدر کی ایک خاص صورت کا نام ہے۔ جب کسی شے کی قدر کا تخمینہ اُن قیمتی دھاتوں کے ساتھ اسکا مقابلہ کرنے سے کیا جائے جو شائستہ اقوام میں بطورِ معیارِ قدر مستعمل ہوں تو کہا جاتا ہے کہ اس شے کی قیمت معلوم ہو گئی ہے۔ گو تمام اشیاء کی قدر ایک ہی وقت میں کم و بیش نہیں ہو سکتی تاہم نہ اُن کی قیمت کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے۔

مندرجہ توضیح سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ مسئلۂ قدر حقیقت میں اُن اسباب کا دریافت کرنا ہے جن پر اشیاء کی قدر ایک معین معیار کے لحاظ سے منحصر ہوتی ہے۔ اِن معنوں میں کوئی شے قدر نہیں رکھ سکتی جب کہ اس میں دو خواص نہ ہوں اول افادت دوم دقت حصول افادت سے مراد یہ ہے کہ اس شے میں کسی انسانی ضرورت یا خواہش کو پورا کر سکنے کی خاصیت موجود ہے۔ یہ گویا ایک قسم کا امتحان ہے کہ جب تک کوئی شے پہلے اس امتحان میں کامیاب نہ ہو لے قدر رکھنے والی اشیاء کی

فہرست میں داخل نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس فہرست میں کوئی خاص درجہ یا مقام حاصل کرنا اس شے کی دقتِ حصول پر موقوف ہے۔ پس ظاہر ہے کہ جسقدر کسی شے میں انسانی ضروریات کو پورا کرسکنے کی خاصیت ہوگی اسی قدر اس شے کی قدر بھی زیادہ ہوگی۔ اسی افادت کی کمی بیشی کی وجہ سے اشیاء کی طلب یعنی مانگ میں اختلاف پیدا ہوتا ہے کیونکہ جسقدر کسی شے میں افادت زیادہ ہوگی اسی قدر اسکی مانگ بھی زیادہ ہوگی اور جس قدر افادت کم ہوں اُسی قدر اُس کی مانگ بھی کم ہوگی۔ خریداران اشیاء کا معاوضہ زیادہ دینگے جنکی ان کو ضرورت ہے مگر جن اشیاء کی اُن کو ضرورت نہیں ہے ان کا معاوضہ اول تو دینگے ہی نہیں یا اگر دینگے تو بہت کم دینے پر راضی ہوں گے۔ بعض محققینِ علم اقتصاد نے انسانی فطرت کے اِس میلان کو ظاہر کرنے کے لئے اصطلاحِ افادتِ انتہائی استعمال کی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اصطلاح مذکور نہایت مفید ہے کیونکہ اس کے استعمال سے بتادلہ کی تحریک اور اس کے فوائد کی توضیح ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم واضح کرنے کی غرض سے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں فرض کرو کہ آٹے کا ایک سیر ایک آدمی کی بقاءے حیات کے لئے ضروری ہے ظاہر ہے کہ اِس ایک سیر میں زیادہ افادت ہوگی لیکن اس شخص کے نزدیک آٹے کے دوسرا اور تیسرے سیر میں وہ افادت نہ ہوگی جو پہلے سیر میں تھی کیونکہ وہ مقدار اس کی بقاءِ حیات کے لئے لازم تھی۔ اس مثال میں مقدار تو وہی ایک سیر ہے لیکن ہر سیر کی افادت آٹے کو استعمال کرنے والے کے لحاظ سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شخص آٹے کے تیسرے سیر کو اس قیمت پر خریدنا پسند نہیں کریگا جس قیمت پر کہ [illegible] سیر کو خریدا تھا۔ پس کسی شے کی افادت انتہائی سے مراد اس شے کی آخری

یا اختتامی حصے کی افادت سے ہے جسکو مشتری قیمت کی اِس کم سے کم مقدار کے عوض میں خرید کرتا ہے جو اُس شے کا بائع منظور کر سکتا ہے۔

مثالِ بالا میں آٹے کے تیسرے سیر یعنی اختتامی یا انتہائی حصے کی قیمت اسکی افادت سے متعین ہو گی۔ چونکہ مثالِ مذکورہ میں خریدار کو آٹے کے تیسرے سیر کی ضرورت نہیں ہے۔ اسواسطے اول تو وہ خریدے گا ہی نہیں اور اگر خریدیگا بھی تو اِس بات پر منحصر ہوگا کہ قیمت کی کم سے کم مقدار ادا کرے آخر کار قیمت کی اس کمتر مقدار پر سودا ہوگا جسکو بائع شے منظور کر سکتا ہے۔

اِس توضیح سے ظاہر ہے کہ خریداروں کے لحاظ سے اشیاء کی معمولی قیمت ان کی افادتِ انتہائی سے متعین ہوتی ہے بعض محققین کے نزدیک یہی افادت قدرِ اشیاء کا اصل اصول ہے مگر یاد رکھنا چاہئے کہ ہر شے کی قدر اس شے کی افادت پر منحصر نہیں ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ جس شے میں قدر ہوگی اس میں افادت بھی ضرور ہو گی لیکن برعکس صحیح نہیں ہے یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ ہر مفید شے کوئی نہ کوئی قدر بھی رکھتی ہو۔ ہوا پانی وغیرہ مفید اشیاء ہیں مگر ان کی قدر کچھ نہیں ہے کیونکہ قدرت خود بخود بغیر انسانی کوشش کے ان کو کثرت سے پیدا کر دیتی ہے۔ اِس کے علاوہ ایک ہی شے بعض اشخاص کے لئے مفید ہوتی ہے اور بعض کے لئے کچھ فائدہ نہیں رکھتی۔ علیٰ ہٰذا القیاس بعض اشیاء خاص خاص مقامات میں افادت رکھتی ہیں بعض میں نہیں۔ مزید براں بعض اشیاء میں مطلق افادت نہیں ہوتی لیکن ان کی قدر بڑی ہوتی ہے مثلاً ہیرے جواہرات وغیرہ۔ غرض کہ افادت قدر کا ماخذ نہیں قرار دی جاسکتی اس کے لئے ہمیں کوئی اور ہی اصول معلوم کرنا چاہئے۔

بعض محققین کی رائے ہے کہ افادت کے علاوہ قدر کے لئے وقت

حصول بھی ضروری ہے یعنی ان کے نزدیک شے کا مفید ہونا اور نیز مشکل سے ابتداً ان کی قدر کا باعث ہوتا ہے۔ اس رائے کو صحیح تسلیم کرنے والے وقت حصول کی تین صورتیں بیان کرتے ہیں۔

(۱) اول یہ کہ اشیاء کی رسد محدود ہو مثلاً گذشتہ مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں یا دیگر کم یاب چیزیں۔ کیا اس صورت میں اشیاء کی قدر اس محنت پر منحصر ہوگی جو ابتداً ان پر صرف ہوئی تھی؟ نہیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ انسان بالعموم اپنی محنت ایسی اشیاء کے معاوضے میں نہیں دیتا جن پر کچھ محنت نہ صرف ہوئی ہو اور نیز بالآخر مجموعی طور پر اشیاء کی قدر قریباً قریباً اس محنت کے مطابق ہوگی جو ان پر ابتداً صرف ہوئی تھی تاہم حق یہ ہے کہ کسی شے کی قدر اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ اس شے کی تیاری میں ابتداً محنت صرف ہوئی تھی بلکہ یہ اس امر پر منحصر ہے کہ وہ شے اب بغیر محنت کے حاصل نہیں ہو سکتی اگر کوئی شاہ نامہ فردوسی کے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا مل جائے تو اس کی قدر اس محنت کا نتیجہ نہ تصور کرنی چاہئے جو ابتداً اس کی تحریر میں صرف ہوئی تھی بلکہ اسکا انحصار اس امر پر ہوگا کہ اکثر لوگوں کو اس نسخہ کی ضرورت ہے اور اب ایسا تیار نہیں ہو سکتا۔ لہذا ابتدائی محنت بھی کسی شے کی قدر کا ماخذ نہیں قرار دی جا سکتی۔ مندرجہ بالا دلیل کے علاوہ اس دعوے کی ثبوت میں ذیل کے دلائل بھی دیئے جا سکتے ہیں:-

(ا) اگر محنت کو قدر کا اصل باعث سمجھا جائے تو قدر کی کمی بیشی محنت کی کمی بیشی پر منحصر سمجھنی چاہئے مگر یہ بات صریحاً تجربے کے خلاف ہے۔ جس وسیع زمین پر لاہور جیسا عظیم الشان شہر آباد ہے اس کی قدر اندازہ سے زیادہ ہے لیکن یہ زمین کسی طرح محنت کا نتیجہ نہیں ہے۔

(ب) اگر محنت کو قدر کا اصل باعث سمجھا جائے تو جن دو چیزوں پر مساوی محنت صرف ہوئی ہے ان کی قدر بھی مساوی ہونی چاہیئے مگر تجربہ اس کے خلاف ہے۔ اگر ایک ٹکڑا سونے اور ایک ٹکڑا لوہے کا دونوں مساوی محنت سے حاصل ہوں تو کیا ان کی قدر بھی مساوی ہوگی۔؟ ہرگز نہیں

(ج) اگر محنت کو قدر کا اصل باعث سمجھا جائے تو ہر شے کی قدر اس محنت سے متناسب ہوگی جو اس شے کے حاصل کرنے میں صرف ہوئی ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص کو خوش قسمتی سے زمین کی سطح پر پڑا ہوا سونے کا ایک ٹکڑا مل جاتا ہے۔ ایک اور شخص کو ویسا ہی ٹکڑا ہفتہ بھر زمین کھود کھود کر ملتا ہے علیٰ ہٰذالقیاس ایک اور شخص ہے جسکو اس قسم کا ٹکڑا مہینے کی محنت کے بعد ملتا ہے۔ اس اصول کے رو سے چاہیئے کہ جس شخص کو مہینے دن کی محنت کے بعد سونے کا ٹکڑا ملا ہے اسکا سونا اس شخص کے سونے سے بہت زیادہ بیش قیمت ہو جسکو بغیر محنت کے زمین پر پڑا ہوا مل گیا تھا۔

(د) اگر محنت کو قدر کا باعث سمجھا جاوے تو جس شے پر محنت صرف کی گئی ہے چاہیئے کہ اسکی قدر دوامی اور مساوی ہو مگر یہ صریحاً غلط ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ایک ہی شے کی قدر مختلف مقامات میں مختلف ہوتی ہے بلکہ بعض جگہ کئی اشیاء کی قدر کچھ بھی نہیں ہوتی حالانکہ ان پر محنت بھی بہت کی گئی ہو۔ افریقہ کے وحشیوں کے درمیان ایک سنسکرت پڑھانے والے پنڈت یا عربی کے تعلیم دینے والے مولوی کا علم کیا قدر رکھ سکتا ہے؟ اگر ہندوستان کے مسلمان ترکی ٹوپیاں پہننا قطعاً ترک کر دیں تو اس اصول کے رو سے ضرور ہے کہ ان کی قدر بدستور قائم رہے اگرچہ ان کی مانگ مطلق نہ ہو۔

(۳) اگر محنت کو وقت قدر کا ماخذ سمجھا جاوے تو محنت کی قدر کا کیا ماخذ ہوگا۔؟

(۲) دوسری صورت دقت حصول کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ کسی شے کی تیاری میں محنت اور سرمائے کی ضرورت ہو۔ اِس ضمن میں جو اشیاء داخل ہیں ان کی قدر یا قیمت اِن اشیاء کے مصارف پیدائش سے متعین ہوگی یہ غلطی بھی اسی غلطی کا ایک نتیجہ ہے کہ اشیاء کی قدر کا ماخذ محنت ہے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ قدر کا انحصار ابتدائی محنت پر نہیں ہوتا بلکہ یہ اس بات پر موقوف ہے کہ موجودہ حالت میں وہ شے بغیر محنت اور سرمائے کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ بعض کوئلے کی کانوں میں اوپر کے تھون کا کوئلہ نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ اور نیچے کے تھون کا کوئلہ اچھا نہیں ہوتا بلکہ اس میں مٹی اور راکھ وغیرہ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اوپر کا کوئلہ نکالنے میں مصارف کی تعداد کم ہوگی اور نیچے کا کوئلہ نکالنے میں چونکہ محنت زیادہ صرف ہوتی ہے اسواسطے مصارف کی تعداد بھی زیادہ ہوگی۔ لیکن اگر اشیاء کی قدر مصارف پیدائش پر منحصر ہے تو چاہیے کہ نیچے کے کوئلے کی قیمت اوپر کے کوئلہ کی قیمت سے بہت زیادہ ہو

(۳) تیسری صورت دقت حصول کی یہ ہے کہ بعض اشیاء اِس قسم کی ہوتی ہیں جنکو ایک معین میعاد کے اندر تیار کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ جن لوگوں کو انکی ضرورت ہے وہ اس عرصہ تک انتظار کریں۔ اس صورت میں اشیاء کی قیمت ان مصارف سے متعین ہوتی سمجھی جائیگی جو ان کے از سر نو تیار کرنے میں عائد ہوتے ہوں۔ مگر یہ بات ہمیشہ صحیح نہیں ہوتی کیونکہ ایک نہایت قدیم زمانے کی کل کو اِن مصارف سے کوئی نسبت نہیں ہے جو اس کے نئے سرے سے تیار کرنے میں عاید ہوتے ہیں کل تو ویسی ہی تیار ہوسکتی ہے مگر چونکہ یہ پرانی کل آثار قدیمہ میں سے تصور کیجائیگی اسواسطے اسکی قدر یا قیمت بہت زیادہ ہوگی۔

پس معلوم ہوا کہ اشیاء کی قدر یا قیمت (کیونکہ قیمت بھی قدر ہی کی ایک صورت ہے) افادت محنتِ ابتدائی یا اُن مصارف پر جو ان کو از سرِ نو تیار کرنے میں عائد ہوں منحصر نہیں ہے اگرچہ یہ تینوں قدر کے عوارضات ضرور ہیں تاہم اسکی ماخذ نہیں قرار دیجا سکتی۔ پھر وہ کونسا کلیہ اصول ہے جس پر اشیاء کی قدر کا دار و مدار ہے؟ اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ قدرِ اشیاء قانون طلب و رسد کے عمل پر انحصار رکھتی ہے[1] جس کی توضیح ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

[1] بعض حکماء ریکارڈو و سمتھ و مل وغیرہ کہتے ہیں کہ بعض اشیاء کی قدر تو ان کی طلب و رسد کی درمیانی نسبت پر انحصار رکھتی ہے مگر بعض کی ان کے مصارف پیدائش پر یہی وجہ ہے کہ ان کو اشیاء مادیہ کی تقسیم کرنی پڑی اور ہر قسم کے لئے خاص قوانین وضع کرنے پڑے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ رائے سراسر غلط ہے۔ کیونکہ جیسا طالب العلم کو آگے چلکر معلوم ہوگا یہ ایک غلط اصول پر مبنی ہے یعنی اشیاء کی قدر اس محنت پر منحصر ہے جو ابتداءً ان کی تیاری میں صرف ہوئی ہو۔ یہ کسطرح ہو سکتا ہے کہ مختلف مقادیر اقتصادیہ کے لئے مختلف قوانین ہوں۔ علم الاقتصاد بھی دیگر علوم طبیعی کی طرح ہے جسطرح ان علوم میں یہ نہیں ہو سکتا کہ بعض فطری مظاہر کی توجیہ کے لئے ایک خاص قانون ہو اور بعض کی توجیہ کے لئے کوئی اور مختلف قانون ہو اسی طرح یہ بات علم الاقتصاد میں بھی محال ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ اکثر صورتوں میں مقابلہ یا تجارتی رشک کے اثر کی وجہ سے اشیاء کی قیمت مصارف پیدائش کے قریب قریب آجائیگی اور ریکارڈو کا اصول صحیح معلوم ہوگا لیکن یہ بات ہر حالت میں درست نہیں ہے۔ بعض دفعہ غلط اصول سے بھی واقعات کی توجیہ ہو جایا کرتی ہے لیکن اس توجیہ سے اصول کی صحت کی نسبت رائے قائم کرنا سراسر خلاف منطق ہے۔ قدیم حکماء کا مذہب تھا کہ اجسام کی حرکت قدرتاً کم ہوتے جانے کا میلان رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ آخرکار بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔ اس اصول سے کئی فطری واقعات کی توجیہ ہو سکتی تھی لیکن زمانہ حال کے حکماء نے اس اصول کی صحت کو تسلیم نہیں کیا اگرچہ اس اصول کے نتائج کو انہوں نے مان لیا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک حرکتِ اجسام قدرتاً کم ہوتے جانے کا میلان نہیں رکھتی بلکہ ہر صورت میں بعض اسباب (مثلاً ہوائی رکاوٹ یا رگڑ وغیرہ) ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جو اس حرکت کو روکتے ہیں اور آخرکار اسکو معدوم کر دیتے ہیں۔

سہولت کے لئے ہم پہلے قانون طلب کا مفہوم واضح کریں گے بعد میں قانون رسد کا پھر دونوں توضیحات کو یکجا کر کے ایک وسیع قانون قائم کرینگے طلب سے مراد کسی شے کی اس خاص مقدار سے ہے جو کسی خاص قیمت پر خرید کیجائے اس تعریف میں ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اس مقدار کی قیمت کا ادا کرنے والا یقینی طور پر اس قیمت کو ادا کر سکنے کی قوت رکھتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ طلب اور خواہش حصول مرادف نہیں تصور کئے جا سکتے کیونکہ ہر شخص ہر شے کے حاصل کرنے کی خواہش کرتا ہے اگرچہ اشیاء مذکورہ کے خرید کر سکنے کی قوت اس میں نہ ہو۔ اس کے علاوہ تعریف مندرجہ بالا میں الفاظ "خاص قیمت" بھی ضروری ہیں کیونکہ قیمت کے تغیر سے شے مطلوب کی مقدار میں بھی تغیر مطلوب ہوگا۔ مقدار مطلوب کے تغیر سے جو تغیر قیمت سے وابستہ ہے قانون طلب کی توضیح ہوتی ہے۔ یعنی جب کسی شے کی قیمت کم ہو جاتی ہے تو بشرطیکہ زر نقد کی قوت خرید اور اس کی وہ رقم جو خریداروں کے قبضے میں ہے مساوی ہے) اس کی مقدار مطلوب بڑھ جاتی ہے اور برعکس اس کے جب قیمت زیادہ ہو جاتی ہے تو مقدار مطلوب کم ہو جاتی ہے۔ ہم نے کہا ہے بشرطیکہ زر نقد کی قوت خرید اور اس کی وہ رقم جو خریداروں کے قبضے میں ہے مساوی رہے۔ اس قید کا ہونا ضروری ہے کیونکہ جوں جوں کسی شخص کے وسائل آمدنی ترقی کرینگے یا یوں کہو کہ جس قدر کوئی شخص زیادہ زیادہ دولت مند ہوتا جائیگا۔ اسی قدر اس میں اشیاء کو زیادہ قیمت کے عوض میں خرید کر سکنے کی قوت بڑھتی جائے گی اور جس قدر اس کے وسائل آمدنی کم ہوتے جائنگی یا جوں جوں وہ رقم جو اس کے پاس ہے کم ہوتی جائیگی اسی قدر اس کی قوت خرید بھی کم ہوتی جائے گی۔ اگر پہلی صورت میں وہ ایک شے کو دس روپیہ [illegible] میں خرید سکتا

تو دوسری صورت میں پانچ روپیہ کو بھی نہ خرید کر سکیگا اگرچہ ضرورت دونوں صورتوں میں ایک سی ہی کیوں نہ ہو پس اس قانون کو مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں کہ اشیاء کی مقدار مطلوب کمی قیمت سے بڑھتی ہے اور زیادتی قیمت سے کم ہوتی ہے مثلاً اگر چھاتوں کی قیمت بڑھ جائے تو بہت سے خریدار جو پہلے چھاتے استعمال کیا کرتے تھے اب انکا استعمال ترک کر دینگے اور صرف وہی لوگ اُن کو خرید کرینگے جو زیادہ قیمت ادا کرنے کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ لہذا چھاتوں کی مقدار مطلوب کم ہو جائیگی۔ اور اگر قیمت کم ہو جائے تو بہت سے لوگ جو پہلے چھاتوں کو استعمال نہیں کرتے تھے۔ اب کمی قیمت کی وجہ سے استعمال کرنے لگ جائینگے لہذا ان کے مقدار مطلوب میں زیادتی ہو جائیگی۔

علیٰ ہذا القیاس رسد سے مراد کسی شے کی کسی خاص مقدار سے ہے جو کسی خاص قیمت کے عوض میں فروخت کئے جانے کے لئے پیش کی جائے اور قانون رسد کو عام الفاظ میں اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ جسقدر قیمت بڑھتی جاتی ہے (بشرطیکہ زر نقد کی قوت خرید اور نیز وہ رقم جو خریداروں کے قبضہ میں ہو مساوی رہے) مقدار اشیاء فروختنی بڑھتے جانیکا میلان رکھتی ہے۔ جب کسی شے کی قیمت زیادہ ملے گی تو ہر تاجر اُسی شے کی تیاری پر سرمایہ صرف کرے گا اور اگر کم ملے گی تو کوئی شخص اس شے کی تیاری پر سرمایہ صرف نہ کرے گا لہذا مقدار مطلوب پہلی صورت میں بڑھے گی اور دوسری صورت میں کم ہوگی۔

اب ہر دو قوانین مذکورہ پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ چونکہ ان دونوں میں ایک متضاد اختلاف ہے اسواسطے تبادلۂ اشیاء کے لئے ضروری

کہ ان کی طلب و رسد میں ایک مساوات پیدا ہو ورنہ تبادلہ محال ہوگا اور جب تبادلہ محال ہوگا تو قدر کی تعیین کس طرح ہو گی۔ لہٰذا مختلف اقتصادی اسباب کے اثر سے اشیاء کی طلب اور رسد میں خود بخود ایک مساوات پیدا ہو جاتی ہے جسکو بطور قانون کے اس طرح قائم کیا جا سکتا ہے کہ ہر منڈی میں اشیاء کی قیمت ان کی مقدار مطلوب اور مقدار رفرختنی کی مساوات سے متعین ہو گی۔ اگر مانگ زیادہ ہو گی اور رسد کم تو اشیاء کی قیمت معمول سے زیادہ بڑھ جائیگی علیٰ ہذا القیاس اگر مانگ کم ہو گی اور رسد زیادہ تو قیمت مذکور معمول سے کم ہو جائیگی۔ پس اشیاء کی قیمت صحیحہ (اس اصطلاح کا مفہوم ابھی واضح ہو جائیگا) کی تعیین۔ کے لئے یہ ضروری ہے کہ طلب اور رسد میں مساوات پیدا ہو یعنی اشیاء کی مطلوب ان کی رسد کے مساوی ہو۔

اِس قانون کے معانی کو زیادہ وضاحت سے بیان کرنے کی غرض ہم مثال کے طور پر ایک جزیرہ فرض کرتے ہیں جہاں ایک ہزار کسان آباد ہے۔ فرض کرو کہ ان لوگوں کو اپنے کھیتوں کے لئے کھاد کی ضرورت ہے اور ہر کسان کھاد کے پانچ چھکڑوں کے عوض میں غلے کے دس پیمانے دینے کو تیار ہے اِس حساب سے گویا کھاد کے پانچ ہزار چھکڑے مطلوب ہیں جنکی قیمت فی چھکڑا دو پیمانے غلہ ہو۔ مگر ممکن ہے کہ قیمت مذکور پر کھاد کی رسد پانچ ہزار چھکڑوں سے زیادہ ہو یا کم۔ بعض آدمی شاید اس قیمت پر کھاد فروخت کرنے کی نسبت ماہیگیری پر گذارہ کرنا زیادہ فائدہ مند تصور کریں۔ اس طرح اگر کسان زیادہ قیمت نہ دینگے تو کھاد کی رسد مطلق نہ ہو گی اور اگر ہو گی تو بہت کم جو ان سب کے درمیان تقسیم ہو گی۔ لیکن اگر بعض کسان زیادہ قیمت دینے

پر راضی ہو جائینگے تو قیمت کی زیادتی کی وجہ سے وہ لوگ ماہی گیری ترک کر دینگے جو پہلے کھاد مہیا کرتے تھے اور کھاد کی رسد پھر زیادہ ہو جائے گی۔ برخلاف اس کے اگر کسی قدرتی سبب سے کھاد کی رسد زیادہ ہو جائے تو جب تک اس کی طلب میں اس قدر زیادتی نہ ہوگی تمام کھاد بیچنے والے ایک دوسرے کی نسبت مقابلۃً قیمت کو کم کرتے جائینگے کیونکہ ہر ایک کی خواہش یہی ہوگی کہ میرا ذخیرہ جلد بک جائے۔ قدرتاً ہر شخص کو اپنا فائدہ مقصود ہوگا خواہ دوسرں کا نقصان ہی کیوں نہو۔

مثالِ بالا سے قانونِ طلب و رسد کا مفہوم تو واضح ہو گیا۔ لیکن ابھی اس سوال کا جواب دینا باقی ہے کہ طلب و رسد میں مساوات کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے ابھی اصطلاح مقابلہ کو استعمال کیا ہے جسکے مفہوم کا ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس مقابلے کے اثر سے ہی طلب و رسد کے درمیان مساوات قائم ہوتی ہے۔ لہذا یہ بیان کرنے سے پیشتر کہ مساواتِ مذکور مقابلہ کے عمل سے کس طرح قائم ہوتی ہے پہلے اسکا مفہوم واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس اصطلاح سے مراد اس مقابلے یا تجارتی رشک سے ہے جو کسی شے کے خریداروں اور بیچنے والوں کے درمیان ہوتا ہے کیونکہ ہر شخص کا مدعا یہی ہوتا ہے کہ کم سے کم مقدار دے اور اس کے عوض میں زیادہ سے زیادہ مقدار حاصل کرے۔ مقابلہ کا عمل باہمی اتحاد رواج اور انسانی اثرات کے منافی ہے۔ کیونکہ ہر شخص قدرتاً اپنی ذات کے لئے کام کاج کرتا ہے جہاں چاہے اپنے مال کو فروخت کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ رواج کی پابندی اسکو کسی خاص مقام میں بیچنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ اور نیز قدرتاً ہر شخص کو اپنی ذاتی منفعت مقصود ہوتی ہے۔ کسی دوسرے کے نقصان وغیرہ کی

اسے کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ یہ ہے مقابلے کا اقتصادی مفہوم۔ اب اسکا اثر سمجھنے کے لئے ذرا مثال مندرجہ بالا پر غور کرو۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ کھاد بیچنے والے مقابلے کی وجہ سے قیمت کم کرتے جائینگے۔ اگر فی چھکڑا غلے کے دو پیمانے دئے جائیں تو صاف ظاہر ہے کہ طلب اور رسد غیر مساوی ہوں گے کیونکہ کھاد فروختنی کی مقدار تو دس ہزار چھکڑا ہے۔ لیکن مانگ صرف پانچ ہزار چھکڑوں کی ہے[ف]۔ اگر قیمت اس سے بھی کم ہو جائے تو رسد شاید ۹ ہزار چھکڑے رہ جائیگی کیونکہ بہت سے کھاد بیچنے والے کھاد مہیا کرنے کا کام چھوڑ کر کسی اور کام میں لگ جائینگے۔ فرضاً اگر کسان یہ سمجھکر کہ مقررہ مقدار کی نسبت زیادہ کھاد ڈالنے سے زمین کے محاصل یا پیداوار میں سے کھاد کی اس زیادہ مقدار کی قیمت نکل آئے گی اور اس خیال سے اور کھاد خریدنا شروع کردیں تو کھاد کی طلب جہاں پہلے پانچ ہزار چھکڑا تھی اب شاید چھ ہزار چھکڑا ہو جائے گی۔ علی ہذا القیاس اگر قیمت اور کم ہو جائے تو رسد اور بھی کم ہو جائیگی۔ پہلے رسد ۱۰ تھی اور طلب ۵ پھر رسد ۹ ہو گئی اور طلب ۶ اسی طرح طلب شاید ۷ ہو جائے اور رسد ۸ غرضیکہ دونوں مقداریں مقابلے کے اثر سے ایک دوسرے کے قریب ہوتی جائینگی۔ فرض کرو کہ اس وقت جب کہ طلب اور رسد کی درمیانی نسبت ۷ : ۸ کی ہے کھاد کی قیمت فی چھکڑا $1\frac{1}{2}$ پیمانہ گیہوں پر ٹھہر گئی ہے اب یہ بات کہ طلب اور رسد کے درمیان

۵ چونکہ کسی شے کی رسد صرف اسی مقدار تک ہی محدود نہیں ہے جو کسی خاص وقت پر منڈی میں موجود ہو بلکہ اس تمام مقدار سے ہے جو اس شے کے بیچنے والے کسی خاص نرخ پر منڈی میں لانے کے لئے تیار ہوں جب تک کہ شے مذکور کی طلب قائم ہے اسواسطے ہم مثال میں فرض کر لیا ہے کہ کھاد بیچنے والے ان [illegible] کھاد کی زیادہ مقدار منڈی میں لا رہے تھے ہیں۔

پوری مساوات کسی ایسی قیمت پر ہوگی جو قیمتِ مذکورہ سے بہت کم یا کسی قدر کم ہو دو امور پر منحصر ہے۔

(۱) کھاد کی اس مقدار کی افادت انتہائی پر جو سات ہزار چھکڑوں سے زائد ہوگی۔

(۲) کھاد بیچنے والوں کی کوئی اور فائدہ مند پیشہ اختیار کر سکنے کی استطاعت پر۔ فرضاً اگر کوئی کسان ۲½ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے ۱۰ چھکڑے خرید کرے تو یہی قیمت مقرر ہو جائے گی بشرطیکہ کوئی کھاد بیچنے والا قیمتِ مذکورہ سے کم قیمت پر کھاد مہیا کرنے پر راضی نہ ہو لیکن اگر اس کسان کو ۲¼ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے کھاد مل جائے تو وہ شائد پانچ چھکڑے اور خرید کرے اگر ایسا ممکن ہو تو ۲¼ پیمانہ گیہوں سے ہی کھاد کی افادت انتہائی متعین ہوگی اور یہی اس کی قیمت فی چھکڑا قرار پا جائے گی۔ اس طرح اگر اسکو ۲ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے اور کھاد مل سکے تو افادت انتہائی اسی نرخ سے متعین ہوگی علیٰ ہذا القیاس ۱½ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے اور کھاد مل سکے تو یہی قیمت قرار پائے گی۔ الغرض ممکن ہے کہ کسان اس طرح کھاد کے بیس چھکڑے خرید لیوے لیکن ظاہر ہے کہ کھاد کے مختلف حصص کی افادت مختلف ہے۔ اگر یہ کسان بیس چھکڑے کھاد کے ایک ہی دفعہ خرید لیتا تو ہر چھکڑے کے لئے اسے مساوی قیمت ادا کرنی پڑتی اور یہ قیمت ۱½ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے ہوتی کیونکہ منڈی میں (بشرطیکہ مقابلہ پورے طور پر اپنا عمل کر رہا ہو) ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت اُن کی افادت انتہائی سے متعین ہوتی ہے اور بالعموم مساوی ہوتی ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اسباب اشیاء کی قیمت میں اختلاف پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اِن بواعث پر ہم آگے چل کر غور کریں گے فی الحال ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کسی شے کی قیمت ہمیشہ اس قیمت سے کیوں مختلف ہوتی ہے جس پر وہی شے تجارت کی منڈی میں فروخت ہوتی ہے۔

لفظ منڈی کی کئی تشریحات کی گئی ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ہر تجارتی شے کی ایک نہ ایک منڈی ضرور ہوتی ہے مثلاً لوہے کی منڈی چاول کی منڈی وغیرہ۔ علی ہذا القیاس ایک ہی قصبے میں اشیاء کا تبادلہ کرنے والوں کے مختلف فریق ہوتے ہیں جن کے درمیان ممکن ہے کہ ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت مختلف ہو۔ پس لفظ منڈی سے مراد ان تمام افراد کی ہے جن کی طلب یا رسد کسی خاص مقام میں کسی خاص شے کی قیمت پر اثر کرے۔ اگر مقابلہ پورے طور پر اپنا عمل کر رہا ہو تو کسی شے کی قیمت ہمیشہ اس کے مصارف پیدائش کے قریب ہوگی یعنی شے مذکور کی رسد کے اس حصہ کے مصارف پیدائش پر جو نہایت ناساعد حالات میں پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہ قیمت گویا اس شے کی افادت انتہائی کا پیمانہ ہوگی یعنی اس حصہ کی افادت انتہائی کا جسکو خریدار اس خاص قیمت پر بغیر اندیشہ نقصان کے خرید نا قبول کر سکتا ہے۔ اسکے علاوہ یہ قیمت ان مساعی اور تکالیف کا معاوضہ ہوگی جو اس کے پیدا کرنے والوں کو نہایت ناساعد حالات میں کام کرنے کی وجہ سے لاحق ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ تمام خریدار اس شے کی مساوی قیمت ادا کریں گے اس واسطے ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے [illegible] سے مساعد حالات میں پیدا

کیا ہے ان کو فائدہ ہوگا یعنی ان کا اجر ان تکالیف و مساعی سے زیادہ ہوگا جو اس کی تیاری کے ساتھ وابستہ ہیں اور جن لوگوں نے اسے نامساعد حالات میں پیدا کیا ہے انکا اجر بمشکل ان کی مساعی و تکالیف کے برابر ہوگا۔ مثلاً فرض کرو کہ چند شخص نہایت مساعد حالات میں کام کرتے ہیں۔ یا یوں کہو کہ ایک ایسی کان کھودتے ہیں جس پر معمولی محنت اور سرمایہ صرف کرنے سے عمدہ لوہا بافراط نکل آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ ان لوگوں کی نسبت بدرجہا فائدہ میں رہینگے جو اسی کام کو نامساعد حالات میں کرتے ہیں یا بالفاظ دیگر ایسی کان کھودتے ہیں جس سے لوہا نکالنے میں بہت سی محنت اور کثیر سرمایہ درکار ہے۔ مقدم الذکر فریق کے فائدے کی وجہ یہ ہے کہ خریدار دونوں کانوں کے لوہے کو مساوی قیمت پر ہی خریدنا قبول کریں گے جس سے پہلا فریق فائدہ میں رہے گا۔ اور دوسرے فریق کو بمشکل اپنے اصل مصارف ہی پلے پڑینگے۔

اگر لوہا بیچنے والوں کے درمیان مقابلہ پورے طور پر اپنا عمل کر رہا ہو تو لوہے کی قیمت رفتہ رفتہ اس کے مصارفِ پیدائش کے قریب آ جائیگی۔ یہی قیمت، جو مقابلے کی وجہ سے مصارفِ پیدائش کے قریب ہو جاتی ہے علم الاقتصاد کی اصطلاح میں قیمت صحیحہ کہلاتی ہے۔ لیکن چونکہ مقابلہ کبھی پورے طور پر عمل نہیں کرتا اسواسطے منڈی میں ہر تجارتی شے کی ایک خاص قیمت ہوتی ہے جسکو اصطلاح میں قیمت متعارف کہتے ہیں اور یہ قیمت قیمت صحیحہ سے کم و بیش مختلف ہوتی ہے کیونکہ اس کو بالعموم کسی شے کے مصارفِ پیدائش کا اندازہ نہیں ہو سکتا اگرچہ خریدار کیلئے اس شے کی افادتِ انتہائی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ قیمت متعارف اور قیمت صحیحہ کا یہ اختلاف مندرجہ ذیل وجوہ پر مبنی ہے۔

(۱) کسی شے کے ذخیرے کی مقدار پر جو منڈی میں موجود ہو۔ یاد رکھنا چاہئے کہ ذخیرہ اور رسد مرادف الفاظ نہیں ہیں۔ ذخیرے سے مراد کسی شے کی اس تمام مقدار سے ہے جو ایک خاص وقت پر منڈی میں موجود ہو اور رسد سے مراد کسی شے کی اس مقدار سے ہے جو فروخت کے لئے پیش کی جا سکتی ہو اگرچہ منڈی میں حقیقۃً موجود نہو۔ لہذا ممکن ہے کہ رسد ذخیرے کا ایک تھوڑا سا حصہ ہو۔ مثلاً جب کسی شے کی قیمت کم ہو تو دکاندار قدرتاً اس شے کا سارا ذخیرہ نہیں بلکہ اسکا تھوڑا سا حصہ فروخت کے لئے پیش کرینگے جو اس صورت میں رسد کہلائیگا۔ جب قیمت بڑھے گی وہ پہلے کی نسبت ذخیرے کی زیادہ مقدار فروخت کیلئے پیش کرینگے۔ غرض کہ قیمت کی زیادتی کے ساتھ ذخیرہ رسد کی صورت میں منتقل ہوتا جائیگا۔ برخلاف اس کے یہ بھی ممکن ہے کہ کسی منڈی میں رسد کی مقدار ذخیرے کی مقدار سے زیادہ ہو۔ مثلاً تجارتی دلال عموماً اشیاء کی ایک کثیر مقدار غلہ روئی وغیرہ مہیا کرنے کا خریداروں سے معاہدہ کرتے ہیں حالانکہ حقیقت میں مقدار معہودہ اسوقت اول تو ہوتی ہی نہیں یا اگر ہوتی ہے تو بہت کم۔ چونکہ خریداروں کی طلب اشیاء کی روزانہ پیداوار سے نہیں بلکہ ان کے ذخیرے سے پوری ہوتی ہے اسواسطے ممکن ہے کہ اس ذخیرے کی کمی بیشی اشیاء کی قیمت متعارف اور قیمت صحیح کے درمیان اختلاف پیدا کردے مثلاً اگر کسی سال کمی رسد کی وجہ سے غلے کی قیمت زیادہ رہی ہے تو دوسرے سال اس کی کاشت زیادہ ہوگی اور اس مزید ذخیرے کی وجہ سے جو اس طرح پیدا ہوگا ممکن ہے کہ قیمت معمول سے بھی کم ہو جائے۔ لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ گو غلے کی رسد کم ہے تو اسکی جگہ نئی کٹنی شروع ہو جاوے اس صورت میں غلے کے ذخیرے کی کمی بیشی اس کی قیمت متعارف پر کچھ اثر نہیں

کر سکتی۔ علیٰ ہٰذا القیاس بعض اشیاء ذخیرہ کھا سکتی ہیں بعض میں ذخیرہ کھانے کی قابلیت نہیں ہوتی۔ یہ سبب بھی ذخیرے کی قیمت متعارف پر اثر کرتا ہے مثلاً بعض اشیاء مچھلی وغیرہ (جو ذخیرہ نہیں کھا سکتی) کی قیمت منڈی میں صبح کچھ ہوتی ہے شام کچھ۔

(۲) محنت کی تنظیم اور کلوں کا استعمال جسکی وجہ سے محنت کے لئے کسی اور پیشے اور سرمائے کے لئے کسی اور صورت میں منتقل ہو جانا مشکل ہو جاتا ہے قیمتِ صحیحہ اور قیمت متعارف کے اختلاف کا دوسرا سبب ہے۔ محقق مارشل فرماتے ہیں کہ "جن پیشوں میں سرمایۂ قائم کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے اُن میں اشیاء کی قیمتیں بہت تغیر پذیر ہوتی ہیں"۔ تمہیں یاد ہوگا کہ طلب ورسد کی توضیح کرتے ہوئے ہم نے دودھ کھا دہیا کرنے والوں کی مثال لی تھی۔ ایسی مثال لینے سے ہماری غرض یہ تھی کہ پیشۂ مذکور میں قیمتِ صحیحہ اور قیمتِ متعارف کے اختلاف کا یہ دوسرا سبب کچھ اثر نہیں کر سکتا کیونکہ یہاں نہ بڑی کلوں کی ضرورت ہے نہ بڑے ہنرمند پیشہ وروں کی جنکی محنت کسی دوسرے پیشے میں منتقل ہو سکتی ہو۔

(۳) بسا اوقات رسم ورواج اور قانون سے بھی اشیاء کی قیمتِ متعارف متعین ہوتی ہے اس کے علاوہ پیشہ وروں کے عادات اور ان کے طبائع بھی بعض دفعہ قیمت کی کمی بیشی پر بہت بڑا اثر رکھتی ہیں۔ جب کسی پیشے کے دستکاروں کی یومیہ اجرت ایک دفعہ مقرر ہو گئی پھر سالوں تک بالعموم وہی اجرت مقرر رہتی ہے۔ خواہ دستکاروں کی تعداد پہلے کی نسبت زیادہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ تم نے سنا ہوگا کہ نکاح پڑھنے والے مولوی اپنی خدمت سے عوض بالعموم ٹھہرا ہی لیا کرتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں افاوتِ انتہائی کا اصول

معطل ہو جاتا ہے اور قیمت رواج سے متعین ہوتی ہے۔ باپ اپنے مریض بیٹے کی زندگی بچانے کے لئے کئی ہزار روپیہ دینے کے لئے بھی تیار ہو گا مگر رواج کے اثر سے اسے حکیم کو وہی دو روپیہ نذرانہ دینے ہوتے ہیں۔

قیمت متعارف اور قیمتِ صحیحہ کے درمیان جو اختلاف ہوتا ہے۔ اس کے بعض اخلاقی وجوہ بھی ہیں مثلاً بعض دفعہ دکاندار افزائش قیمت کی توقع میں اپنا ذخیرہ اشیاء فروخت کے لئے منڈی میں لاتے ہی نہیں اگرچہ نفع کی امید میں ان کو بسا اوقات نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے۔ خردہ فروشی کی صورت میں ان اخلاقی وجوہ پر غور کرنا اور بھی ضروری ہے۔ ہمنے اوپر بیان کیا تھا کہ اگرچہ ایک ہی منڈی میں ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت مساوی ہوتی ہے تاہم بعض اسباب اس مساوات کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ بالعموم خریدار ایسے ہوشیار نہیں ہوتے کہ اشیا خریدنے کی اصل وقعت کو سمجھتے بوجھتے ہوں اسواسطے دکاندار انہیں سادہ لوح سمجھکر دھوکا بھی دیدیا کرتے ہیں اور اس طرح اپنی اشیاء کو دگنی چوگنی قیمت پر بیچ لیتے ہیں۔ چونکہ ہر دکاندار اس طرح نہیں کرتا اسواسطے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی منڈی میں ایک ہی قسم کی قیمت میں مساوات قائم نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے بعض مصنفین کی رائے ہے کہ خردہ فروشی کی صورت میں اشیاء کی قیمت مقابلے سے نہیں بلکہ رواج سے متعین ہوتی ہے۔ اور اس وجہ سے یہ امر عموماً مسلم ہے کہ خردہ فروشوں کو اصولِ عدل و اخلاق کے رو سے اپنی اشیاء کی قیمت اس قدر لینی چاہئے کہ تجارتی لحاظ سے اس قیمت سے کم قیمت قبول نہ کی جا سکتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اہل الرائے کے نزدیک خردہ فروشی اقتصادی اصول پر نہیں بلکہ اخلاقی

باب دوم

تجارت بین الاقوام

گذشتہ باب میں ہم نے تعیینِ قدر پر بحث کی ہے اور اس بات کو ثابت کیا ہے کہ اشیاء تجارتی کی قدر قانون طلب و رسد کے عمل پر منحصر ہے مگر اس باب میں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آیا یہ قانون تجارت کی ہر صورت میں صادق ہے ممکن ہے کہ جب تبادلہ اشیاء ایک ہی ملک کے مختلف حصوں کے درمیان ہوتا ہو تو تعیینِ قدر اسی قانون کے تابع ہو مگر جب یہ تبادلہ مختلف ممالک اور اقوام کے درمیان ہوتا ہو تو اختلاف حالات کی وجہ سے تعیین قدر کا کوئی اور قانون ہو۔ اس کتاب کے حصہ اول میں ہم نے بیان کیا تھا کہ اختلاف حالات کی وجہ سے علمی اصول میں تغیر آجانا ممکن ہے لہذا اب ہمارا مقصد اس امر کی تحقیق کرنا ہے کہ آیا تجارت کی ہر دو مندرجہ بالا صورتوں میں قدر اشیاء کی تعیین ایک ہی اصول کے تابع ہے یا مختلف اصول کی تحت میں ہے۔ مگر پیشتر اس کے کہ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تجارت بین الاقوام کی عام خصوصیات اور اس کے فوائد سے تمہیں آگاہ کیا جائے۔ بعض محققین کی رائے میں تجارت بین الاقوام اس تجارت سے مختلف نہیں ہے جو ایک ہی ملک کے مختلف حصوں کے درمیان ہوتی ہے لہذا اسکے لئے کسی نئے اصول کی ضرورت ہی نہیں ہے وہی پہلا قانون طلب و رسد یہاں

بھی صادق آئیگا ۔ یہ حکما تجارت بین الاقوام پر مختلف اعتراض پیش کرتے ہیں جنمیں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) تجارت کبھی مختلف اقوام کے درمیان ہوتی ہی نہیں ۔ بلکہ افراد کے درمیان ہوتی ہے ۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ انگلستان اور ہندوستان باہم تجارت کرتے ہیں تو اسکا مفہوم یہ ہوا کرتا ہے کہ ہر دو اقوام میں سے خاص خاص افراد ہیں جو آپس میں تبادلۂ اشیاء کرتے ہیں ۔ لہذا تعیینِ قدر کا جو قانون تجارتِ بین الافراد کی صورت میں صحیح ہے وہی تجارتِ بین الممالک کی صورت میں بھی صحیح ہوگا ۔

(۲) تجارت کی ہر صورت کے لئے تعیینِ قدر کا ایک منفرد اصول ہونا چاہئے جو تمام حالات پر حاوی ہو ۔ یہ بات علمی اصول کے خلاف ہے کہ ایک ہی قسم کے واقعات کی توجیہ کے لئے مختلف قوانین وضع کئے جائیں ۔

(۳) زمانۂ حال میں ایجادات کی وجہ سے فاصلہ اور بعد موانع تجارت نہیں رہے اسواسطے تجارت بین الاقوام یا بین الممالک کو تجارت کی دیگر صورتوں سے متمیز کرنا صحیح نہیں ہے ۔

اِس میں کچھ شک نہیں کہ مختلف ممالک کی تجارتی اغراض میں ایک قسم کی یگانگت ضرور ہے ۔ تاہم اقوام و ممالک کا انفراد ایک ایسا صریح واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ کسی ایک ملک کی صورت میں یہ صحیح ہے کہ اس کے مختلف حصص کے درمیان محنت اور سرمایہ یا یوں کہو کہ دستکار اور سرمایہ دار بلا روک ٹوک ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتے ہیں ۔ بلکہ اقتصادی لحاظ سے [illegible] کہ یہ تجارتی

اشیاء کے پیدا کرنے والوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے مختلف اجزاء کے درمیان محنت اور سرمایہ بلا روک ٹوک حرکت کر سکتے ہوں۔ اس تعریف کے رو سے لفظ قوم کے مفہوم میں دو شرائط داخل ہیں۔

(۱) ہر ایک مجموعہ کے افراد کے درمیان سرمایہ اور محنت ایک مقام سے دوسرے مقام میں بلاقید منتقل ہو سکنا۔

(۲) ایک مجموعے کے دستکاروں یا کارکنوں کا دوسرے مجموعے کی طرف منتقل نہ ہو سکنا یعنی ایک ملک کے دستکاروں یا سرمایہ داروں کا دوسرے ملک میں نہ جا سکنا۔ مندرجہ بالا اعتراضات کا اصل منشاء زیادہ تر یہی ثابت کرنا ہے کہ خصوصاً زمانہ حال میں ایک ملک کے دستکار اور سرمایہ دار دوسرے ممالک میں آسانی سے جا سکتے ہیں کیونکہ فاصلے کی دقتیں جو زمانۂ قدیم میں حائل تھیں اب مختلف اقسام کی ایجادات و تسہیل سفر کی وجہ سے مفقود ہو گئی ہیں۔ ہم اس بات کو کسی حد تک تسلیم کرتے ہیں لیکن باوجود اس بات کے یہ بھی صحیح ہے کہ سرمائے اور محنت کے ایک مجموعہ افراد یا قوم کی طرف جا سکنے میں چند ایسے مشکلات ہیں جن پر غور کرنا ضروری ہے۔

اول جغرافی اعتبار سے مختلف ممالک کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے جس کی مقدار بعض دفعہ بہت بڑی ہوتی ہے۔

دوم مختلف ممالک کی طرز حکومت مختلف ہوتی ہے کہیں مطلق العنان حکومت ہے۔ کہیں جمہوری۔

سوم مختلف ممالک و اقوام کے مذاہب اصول معاشرت و رسوم وغیرہ مختلف ہوتے ہیں غرضیکہ اگرچہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مختلف اقوام کے درمیان سرمایہ اور محنت حرکت کر ہی نہیں سکتے تاہم یہ صاف ظاہر ہے اس حرکت

میں دقت ضرور ہے اور یہی دقت تجارت بین الاقوام کو تجارت کی دیگر صورتوں سے متمیز کرتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ اگر کسی ملک کے مختلف حصص کے درمیان سرمایہ اور محنت بلا روک ٹوک حرکت نہ کر سکتے ہوں تو اس ملک میں تجارتی مقابلہ مفقود ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ مقابلے کی موجودگی یا عدم موجودگی سے تجارتی اشیاء کی قدر میں تغیر آجاتا ہے جس سے اگرچہ قانون طلب ورسد باطل نہیں ہوجاتا تاہم متاثر ضرور ہوتا ہے۔ ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ مختلف ممالک کے درمیان سرمایہ اور محنت آزادانہ حرکت نہیں کرسکتے۔ پس مندرجہ بالا اصول کے مطابق تجارت بین الاقوام کی صورت میں مقابلے کی عدم موجودگی کی وجہ سے قانونِ طلب ورسد کو متاثر ہونا چاہئے موجودہ تحقیقات سے ہمارا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ مندرجہ بالا اسباب کی یہ قانون کس طرح اور کہاں تک متاثر ہوتا ہے؟ اِس سوال کا جواب آگے چلکر دیا جائے گا۔ فی الحال ہم تجارتِ خارجی کے چند فوائد بیان کرنا چاہتے ہیں۔

تجارتِ بیرونی یا تجارت بین الاقوام کے ذریعہ سے ہم وہ اشیاء حاصل کرسکتے ہیں جو ہمارے ملک میں پیدا نہ ہوتی ہوں یا تو اِس وجہ سے کہ ہمارے ملک کی آب وہوا ان اشیاء کی پیدائش کے لئے ناموافق ہے یا لوگوں میں صنعت وحرفت کی قابلیت ہی نہیں ہے کہ اِن اشیاء کو تیار کرسکیں۔ غرض کہ تجارت خارجی سے ہر ملک دیگر ممالک کی پیدا کردہ اشیاء سے بہرہور ہوسکتا ہے۔ علاوہ اس کے اِس طریق عمل سے محنت اور سرمائے کی کارکردگی بہت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً انگلستان میں لوہا اور کوئلہ اس کثرت سے ہے کہ وہاں اس کی پیدائش کے لئے دیگر ممالک کی نسبت

محنت اور سرمایہ کم صرف ہوتا ہے۔ لیکن اس ملک میں ایسی زمین بہت کم ہے جو قابلِ زراعت ہو وہاں کا غلہ وہاں کے باشندوں کے لئے بھی کافی نہیں ہے اور اگر غلے کی پیداوار کو زیادہ کرنے کی کوشش کی جائے تو بہت سی ناقص زمینیں کاشت کرنی پڑینگی جس سے غلے کی قیمت بہت گراں ہو جائیگی۔ دیگر ممالک مثلاً فرانس و ہندوستان وغیرہ میں غلہ بافراط پیدا ہوتا ہے۔ اِس لئے اگر انگلستان اپنی اشیاء کا مبادلہ اُن ممالک کے غلے سے کرے تو سب کو فائدہ ہوگا۔ ایک زمانہ میں یہ خیال مروج تھا کہ تجارت بیرونی سے جو فوائد ہوتے ہیں اُنکا تخمینہ اس زرِ نقد سے لگایا جاتا ہے جو ایک ملک سے دیگر ممالک طرف منتقل کیا جاوے۔ اِس بناء پر ہر ملک کے لوگ یہی تقاضا کرتے تھے کہ اشیاء برآمد میں زیادتی ہو اور اشیاء درآمد میں کمی کی جاوے کیونکہ اول الذکر کی زیادتی سے زرِ نقد ہاتھ آتا ہے اور مؤخر الذکر کی زیادتی سے ہاتھ سے جاتا ہے۔ اِس غرض کے حصول کے لئے بہت سی تجاویز عمل میں لائی جاتی تھیں برآمد کی مقدار بڑھانے کے لئے انعام دیئے جاتے تھے اور درآمد کی مقدار کو کم کرنے کے لئے طرح طرح کے محصول لگائے جاتے تھے۔ اِس طرح مختلف ممالک کے درمیاں بجاے اتحاد کے اختلاف پیدا ہوتا تھا۔ اِس طریقِ عمل کو نظامِ تجارت کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا لیکن اب ایک مدت سے اسکا اصل مغالطہ کھل گیا ہے جس کی توضیح ذیل کی مثال سے ہو سکتی ہے۔ فرض کرو کہ انگلستان اور فرانس کی باہمی تجارت سے صرف یہی مراد ہے کہ انگلستانی لوہے کا مبادلہ فرانس کے غلے سے ہوتا رہے۔ نیز فرض کرو کہ فرانس میں ۲۰ من لوہا پیدا کرنے کے لئے اِسقدر محنت اور سرمایہ درکار ہے جس قدر ۳۰ من غلے کے لئے مگر ولایت میں اس قدر س[illegible]

اور محنت درکار ہے جسقدر دس من غلے کے لئے۔ اِس لئے لوہے کی قدر بلحاظ غلے کے فرانس میں انگلستان کی نسبت دُگنی ہے۔ اب اگر انگلستان اور فرانس ان دونوں اشیاء کا باہمی مبادلہ کریں تو دونوں کے حق میں مفید ہوگا۔ اگر فرانس ولائت کے ہر ۲۰ من لوہے کے واسطے ۱۵ من غلہ مبادلے میں دے تو انگلستان کو ۵ من غلہ منافع میں رہے گا۔ علے ہذاالقیاس فرانس کو بھی فائدہ ہوگا کیونکہ فرانس ۲۰ من لوہا خود پیدا کرے تو اسے اسی قدر محنت اور سرمایہ صرف کرنا پڑے گا جسقدر ۲۰ من غلے کے پیدا کرنے کے لئے درکار ہے۔ مفروضہ صورت میں اسکو صرف ۱۵ من غلہ دینا پڑے گا اسلئے دونوں فائدے میں رہینگے اور کسی کا بھی نقصان نہ ہوگا۔

اِس مثال سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ تجارت خارجی کے فوائد حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری شرط ہے کہ اشیاء متبادلہ کی قدر اضافی ہر دو ممالک میں مختلف ہو ورنہ تجارت مذکور کا کچھ فائدہ نہ ہوگا بلکہ اخراجاتِ باربرداری ضائع ہوں گے۔ مذکورہ اختلاف تجارتِ خارجی کی مقدم شرط ہے اور اصطلاحاً اختلافِ مصارف متقابلہ کہلاتا ہے۔ لیکن بعض اہل الرائے کہتے ہیں کہ تجارتِ خارجی کی اس مقدم شرط سے دو مضرت رسان نتیجے پیدا ہوتے ہیں جن سے گریز نہیں کی جاسکتی :۔

(۱) اگر تجارت خارجی اختلاف مصارف متقابلہ پر مبنی ہے تو ممکن ہے کہ بعض ممالک کو دیگر ممالک سے ایسی اشیاء حاصل کرنے میں فائدہ ہو جنکو وہ خود نسبتاً کم مصارف پر پیدا کر سکتے ہیں۔

(۲) ممکن ہے کہ بعض ممالک خاص خاص اشیاء کا پیدا کرنا ترک کر دیں جو ان کے لئے ودقدرتاً یا دیگر اسباب کی وجہ سے نسبتاً زیادہ موزون ہیں اور

سمجھیں کہ ان خاص اشیاء کو دیگر ممالک سے تبادلے میں حاصل کرنا زیادہ مفید ہے۔ ان ہر دو نتائج کا مفہوم ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ فرض کرو کہ الف اور ب دو مختلف ممالک ہیں اور ن اور ق دو اشیاء ہیں جنکے پیدا کرنے کے لئے ہر ملک بجائے خود ایک خاص قابلیت رکھتا ہے۔ نیز فرض کرو کہ الف کی قوت پیداوار ۲ ن یا ۳ ق ہے اور ب کی ۱ ن یا ۲ ق ہے ظاہر ہے کہ اگر دونوں کے درمیان کوئی تبادلہ نہ ہو تو کل پیداوار ۳ ن + ۵ ق ہوگی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ن ق سے قدر میں زیادہ ہے۔ کیونکہ ملک الف میں دونوں کے پیدا کرنے کے لئے اس قدر محنت اور سرمایہ درکار ہے جسقدر ۳ ق کی پیدائش کے لئے اور ملک ب میں ایک ن کی پیدائش کے لئے اس قدر سرمایہ درکار ہے جسقدر ۲ ق کے لئے۔ لہذا ملک الف کے لئے تجارتی لحاظ سے یہی مناسب ہے کہ وہ صرف ن ہی پیدا کرے اور ب کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ صرف ق ہی پیدا کرے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہے کہ ملک الف کو دونو اقسام کی اشیاء کی پیدائش میں سہولت ہے اور نیز ق کی پیدائش میں بہ نسبت ن کے اسکو زیادہ سہولت ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ان نتائج کو کسی حد تک تسلیم کرنا پڑتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام تجارت خارجی اس قسم کی نہیں ہے جو کی جیسی کہ مثال بالا میں فرض کی گئی ہے۔ بالعموم ہر ملک ایسی اشیاء ہی تبادلے میں لیتا ہے جنکا پیدا کرنا قدرتی طور پر یا دیگر اسباب کی وجہ سے اس ملک کے لئے مشکل ہو۔ پس تجارت خارجی کا سب سے پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس سے ہر ملک مستفید ہوتا ہے علاوہ اسکے کئی دیگر فوائد بھی اس سے پیدا ہوتے ہیں جنکی تفصیل مندرجہ ذیل ہیں :—

(۱) تجارتِ خارجی کی وساطت سے ہر ملک کو بغیر کاوش کے ایسی اشیاء دستیاب ہو سکتی ہیں جنکو یہ بغیر دقت کے پیدا نہ کر سکتا۔

(۲) تجارت خارجی انقسامِ محنت کی ایک صورت ہے جس سے ہر ملک اِن اشیاء کی تیاری میں اپنا سرمایہ صرف کرتا ہے جن کے پیدا کرنے کے لئے وہ خصوصیت سے موزوں ہے اور جن کی تیاری سے فائدہ کی زیادہ سے مقدار حاصل ہو۔

(۳) تجارت خارجی کی وساطت سے اشیاء کی فروخت کے لئے منڈیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

(۴) تجارتِ خارجی کی وساطت سے مختلف اقوام کے دستکار اپنی اپنی ہنرمندی میں بے انتہا ترقی کر سکتے ہیں۔

(۵) تجارت خارجی سے مختلف اقوام کا میل جول ہوتا ہے جس سے کئی ایک تمدنی اور اخلاقی فوائد پیدا ہوتے ہیں۔

تجارتِ خارجی کی عام خصوصیات اور فوائد بیان کرنے کے بعد اب ہم اصل سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنی وہ کون سے شرائط ہیں جن کے لحاظ سے تجارتِ خارجی کا منافع تبادلے کے مختلف فریقوں کے درمیان تقسیم ہوتا ہے ؟ یا بالفاظِ دیگر یوں کہو کہ تجارتِ خارجی کی خصوصیات اِن اشیاء کی قدر پر کس طرح اثر کرتی ہیں جو اس تجارت کا مقصود ہیں ؟ یا مختصراً شرح تبادلہ کن اسباب سے متعین ہوتی ہے ؟ -

تجارت بین الافراد کی صورت میں یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ فریقین تبادلہ کے درمیان شرح تبادلہ کیا ہوگی - اِس مشکل کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں پورے حالات نہیں معلوم ہوتے اور نہ ہو سکتے ہیں - بھلا ہمیں کس طرح علم ہو سکتا ہے کہ

کہ ایک خاص فرد کو کسی خاص شے کی کسقدر شدید ضرورت ہے۔ لیکن تجارت
بین الاقوام کی صورت میں اقوام کی ضروریات کا اندازہ کسی قدر ہو سکتا ہے
لہذا تجارت کی اس خاص صورت میں بھی بشرطیکہ مختلف ممالک کے درمیان
سرمایہ محنت اور تجارتی اشیاء بلا روک ٹوک جا سکتی ہوں۔ تعیین قدر کا
وہی پہلا اصول صحیح معلوم ہوتا ہے یعنی شرح تبادلہ تجارت بین الاقوام کی صورت
میں بھی اس مساوات پر منحصر ہے جو مختلف اقوام کے طلب و رسد اشیاء کے
درمیان ہو۔ مثلاً دو ملک ہیں ا اور ب مقدم الذکر لوہا پیدا کرتا ہے اور
مؤخر الذکر شراب۔ ظاہر ہے کہ اگر الف کو شراب کی زیادہ ضرورت ہے اور
ب کو لوہے کی اسقدر ضرورت نہیں ہے تو شراب کی تھوڑی سی مقدار
کے عوض میں ب کو بہت سی مقدار لوہے کی دینی ہوگی۔ اسواسطے یہ ممکن ہے
کہ کوئی ملک دیگر ممالک سے ایسی اشیاء حاصل کرتا رہے جنکو یہ خود نسبتاً

لہ یہ امر علوم ریاضیہ کی مدد سے مندرجہ ذیل طور پر ثابت ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس تشریح کی ضرورت
نہ تھی تاہم اس خیال سے کہ طلباء کو علوم کی باہمی استمداد کا طریق معلوم ہو ہم اس کو یہاں درج
کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ دو اشیاء متبادلہ ہیں جنکو مختلف مقادیر میں تقسیم کرنے سے انکی ذاتی
خواص میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جتنی مقداروں میں چاہو تقسیم کر کے انکا باہمی تبادلہ کرتے جاؤ۔
نسبت تبادلہ وہی رہے گی۔ فرض کرو کہ ان کے تبادلے کی وہی نسبت ہے جو ق : ن سے ہے
ظاہر ہے کہ ق کا ہر دسواں حصہ یا گیارہواں حصہ ن کے ہر دسویں حصے یا گیارہویں حصے کے
عوض میں دیا جائیگا کیونکہ ان اشیاء کے مساوی حصص کے درمیان تمیز کرنے کی کوئی وجہ نہیں
ہے۔ پس یہ نتیجہ اس طرح پر ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ $\frac{\text{دن}}{\text{دق}} = \frac{\text{ن}}{\text{ق}}$ (د کو ن کے ساتھ
ضرب دینے سے ہماری مراد اشیاء متبادلہ کے مساوی حصص ظاہر کرنے کی ہے) اس نتیجہ کو
ملحوظ خاطر رکھ کے فرض کرو کہ ل ق گندم کی ایک خفیف سی مقدار ہے اور ل ن آہن کی

کم مصارف پر پیدا کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اسکا اپنا سرمایہ اور محنت ایسی اشیاء کے پیدا کرنے میں صرف ہوتی رہے جنکے پیدا کرنے کے لئے یہ خصوصیت سے موزون ہے۔ پس ایسی اشیاء کی قدر جنکو ہم دوسرے ملک سے تبادلے میں حاصل کرتے ہیں اِن مصارف پر منحصر نہیں ہے جو اِن اشیاء کو اپنے ملک میں پیدا کرنے سے ہمیں ادا کرنے پڑتے اور نہ یہ ان مصارف پر منحصر ہے جو اس ملک کو ادا کرنے پڑتے ہیں جہاں یہ پیدا کی جاتی ہیں بلکہ یہ قدر ان اشیاء کے مصارف پیدائش پر منحصر ہے جو ہمیں ان کے عوض میں (کرایہ باربرداری کو ملحوظ رکھکر) دیگر ممالک کو تبادلے میں دینے پڑتے ہیں مثلاً اوپر کی مثال میں ملک الف میں شراب کی قدر اس لوہے کے مصارف پیدائش پر منحصر ہے جو شراب مذکور حاصل کرنے کی غرض سے تبادلے میں دیا جاتا ہے۔

عام صورتوں میں تو یہ صحیح ہے کہ شرح تبادلہ قانون طلب و رسد کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱۔ ایک خفیف سی مقدار جو اس کے عوض میں دی جاتی ہے۔ چونکہ گندم اور آہن دونوں ایسی اشیاء میں کہ انکو مختلف مقادیر میں تقسیم کرنے سے ان کے خواص فوائد میں کوئی فرق نہیں آتا اسواسطے ظاہر ہے کہ ایک ہی منڈی میں ان کے مساوی حصص کے درمیان نسبت تبادلہ وہی ہوگی جو ان کے کل مقداروں کے درمیان ہے لہذا اگر ق کل مقدار گندم کی ہو جو ن یعنی کل مقدار آہن کے عوض میں دی جاتی ہے۔ تو ل ن اور ل ق کے درمیان وہی نسبت تبادلہ ہوگی جو ن اور ق کے درمیان ہے لہذا $\frac{\text{ل ن}}{\text{ل ق}}$ یا ل ن = $\frac{\text{ن}}{\text{ق}}$ × ل ق۔ موازنہ تجارت کی حالت میں اِن ہر دو مقادیر کی طلب ہر دو فریق تبادلہ کے لئے مساوی ہوگی کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو اور تبادلے کی ضرورت پڑے گی۔ اب دیکھو کہ ل ن کی مقدار ل ق یعنی گندم کے مقدار سے $\frac{\text{ن}}{\text{ق}}$ گنا بڑی ہے اب ان کی طلب کے

تتمہ صفحہ ۱۰۲ - درمیان مساوات قائم رکھنے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ آہن کی طلب گندم کی طلب سے $\frac{\text{ق}}{\text{ن}}$ گنا بڑی ہو جس سے یہ اصول قائم ہوتا ہے کہ "اشیاء متبادلہ کی طلب ان کی مقادیر متبادلہ کے ساتھ نسبت معکوس رکھتی ہے"۔

اب فرض کرو کہ پہلے فریق تبادلہ یا ا کے پاس گندم کی مقدار س تھی اور دوسرے فریق ب کے پاس آہن کی مقدار ص تھی چونکہ تبادلے میں گندم کا ق حصہ آہن کے ن حصہ کے عوض دیا جاتا ہے اسواسطے تبادلے کے بعد مندرجہ ذیل صورت ہوگی۔ الف کے پاس (س - ق) گندم ہوگی اور ن آہن اور ب کے پاس ق گندم ہوگی اور (ص - ن) آہن۔ اگر مثلاً الف کی طلب گندم کو $\text{ح}_{\text{ا}}$ (س - ق) سے اور ب کی طلب گندم کو $\text{ح}_{\text{ب}}$ ق سے علی ہذا القیاس الف کی طلب آہن کو $\text{ع}_{\text{ا}}$ ن سے اور ب کی طلب آہن $\text{ع}_{\text{ب}}$ (ص - ن) سے تعبیر کیا جائے تو الف تبادلے پر رضامند نہ ہوگا جب تک کہ مندرجہ ذیل مساوات صحیح نہ ہو:- یعنی

$$\text{ح}_{\text{ا}}(\text{س} - \text{ق}) \times \text{د ق} = \text{ع}_{\text{ا}}\,\text{ن} \times \text{د ن} \quad \text{یا} \quad \frac{\text{ح}_{\text{ا}}(\text{س} - \text{ق})}{\text{ع}_{\text{ا}}\,\text{ن}} = \frac{\text{د ن}}{\text{د ق}}$$

چونکہ مندرجہ بالا اصول کے مطابق $\frac{\text{د ن}}{\text{د ق}} = \frac{\text{ن}}{\text{ق}}$ ہے بہذا $\frac{\text{ح}_{\text{ا}}(\text{س} - \text{ق})}{\text{ع}_{\text{ا}}\,\text{ن}} = \frac{\text{ن}}{\text{ق}}$ - علی ہذا القیاس جو کچھ الف کی صورت میں صحیح ہے وہی ب کی صورت میں بھی صحیح ہونا چاہئے۔ یا یوں کہو کہ اس کی طلب آہن (یعنی ان مقادیر آہن کی طلب جنکا تبادلہ سب سے آخر میں ہوا ہے) ب کی طلب گندم کے مساوی ہونی چاہئے (یعنی ان مقادیر گندم کی طلب جنکا تبادلہ سب سے آخر میں ہوا ہے) لہذا مندرجہ ذیل مساوات ب کی صورت میں صحیح ہونی چاہئے۔

$$\text{ع}_{\text{ب}}(\text{ص} - \text{ن}) \times \text{د ن} = \text{ح}_{\text{ب}}\,\text{ق} \times \text{د ق} \quad \text{یا} \quad \frac{\text{ح}_{\text{ب}}\,\text{ق}}{\text{ع}_{\text{ب}}(\text{ص} - \text{ن})} = \frac{\text{ن}}{\text{ق}}$$

لہذا کلیہ اصول یہ قائم ہوا کہ تبادلۂ اشیاء (ایسی اشیاء کے لئے جو بغیر ذاتی اوصاف کھونے کے مختلف مقادیر میں تقسیم ہو سکتی ہوں) کے لئے مندرجہ ذیل دو مساواتیں صحیح ہونی چاہئے۔

$$\frac{\text{ح}_{\text{ا}}(\text{س} - \text{ق})}{\text{ع}_{\text{ا}}\,\text{ن}} = \frac{\text{ن}}{\text{ق}} = \frac{\text{ح}_{\text{ب}}\,\text{ق}}{\text{ع}_{\text{ب}}(\text{ص} - \text{ن})}$$

رو سے ہی متعین ہوتی ہے مگر جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں تجارت بین الاقوام میں چند ایک خصوصیات ہیں جن سے یہ قانون متاثر ہوتا ہے۔

اول یہ کہ بعض اوقات فریقین تبادلہ آپس میں اتفاق کر کے ایک خاص شرح تبادلہ مقرر کر لیتے ہیں۔

دوم اگر اشیاء متبادلہ کی پیداوار قانون تقلیل حاصل کی تابع ہو تو جب ان کی پیداوار ایک ملک میں نقطۂ تقلیل تک پہونچ جائیگی دیگر ممالک ضرورت سے مجبور ہو کر اسی شے کو پیدا کرنے کی کوشش کرینگے نتیجہ یہ ہوگا کہ تجارت بین الاقوام کا دائرہ دن بدن تنگ ہوتا جائے گا جس سے شرح تبادلہ پر ایک نمایاں اثر ہوگا۔

سوم بعض حالات یعنی بعد مسافت اور کثرت مصارف باربرداری وغیرہ کی وجہ سے مختلف اقوام کے درمیان تجارتی مقابلہ مفقود ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کی موجودگی یا عدم موجودگی سے اشیاء تجارتی کی قدر میں تغیر آجاتا ہے۔ مثال کے لئے فرض کرو کہ فرانس میں نہایت عمدہ کاغذ تیار ہوتا ہے جو ہندوستان اپنی اشیاء کے تبادلے میں اس سے لیتا ہے۔ نیز فرض کرو کہ دیگر ممالک بعض وجوہ سے اس صنعت میں فرانس کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس صنعت سے فرانس خاصۃً فائدہ اٹھائیگا مگر جب اور قومیں فرانس کا مقابلہ کرنے کو آمادہ ہو جائیگی اور کاغذ تیار کرینگی تو ظاہر ہے کہ کاغذ کی قدر میں فرق آجائیگا اور ہندوستان کو اس مقابلے کی وجہ سے فائدہ ہوگا۔

چہارم بعض اوقات ایسے مواقع پیش آجاتے ہیں کہ دو مختلف ممالک کے تجار کو تبادلہ اشیاء میں مشکلات ہوتی ہیں مثلاً کثرت مصارف باربرداری

دلالوں کی دلالی اور محصول درآمد و برآمد۔ اِن اسباب سے اشیاء کی قدر میں تغیر آجاتا ہے اور تجار کے فائدے میں کمی ہوجاتی ہے لہذا یہ اسباب بھی شرح تبادلہ پر اپنا اثر کئے بغیر نہ رہینگے۔ غرض کہ اس قسم کے بعض اسباب اور بھی ہیں جو شرح تبادلہ پر اثر کرتے ہیں مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ قانونِ کلیہ طلب و رسد ان اسباب کے اثر سے باطل نہیں ہوجاتا ہاں اسکا عمل اُن کے اثر سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ ابھی حال ہی کا ذکر ہے ولائتی شکر ہماری ملک میں اس کثرت سے آنی شروع ہوگئی کہ ایک روپے کی پانچ سیر بکنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ملک میں لوگوں نے گنوں کی کاشت ہی چھوڑ دی کیونکہ ولائتی شکر دیسی شکر سے مقابلۃً سستی بکتی تھی یہ حالت دیکھکر سرکار ہند نے ولائتی شکر پر اب اسقدر محصول درآمد لگادیا ہے کہ یہ ہماری دیسی شکر سے سستی نہ بک سکے گی۔ اس مثال سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں ولائتی شکر کی تعیین قیمت میں قانونِ طلب و رسد کا اس قدر دخل نہیں ہے جسقدر کہ سرکار دولت مدار کے حاکمانہ فعل کا۔

اِس ضمن میں یہ بیان کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب دو ممالک آپس میں تجارت کرتے ہیں تو بسا اوقات ایک ملک دوسرے ملک کا زیر بار ہوجاتا ہے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیر بار شدہ ملک کی اشیاء برآمد و درآمد

سلہ تبادلات خارجی کا مضمون علم الاقتصاد کا ایک بڑا ضروری حصہ ہے لیکن چونکہ اسکا تعلق زیادہ تر عمل سے ہے اور اسکا کامل طور پر سمجھنا تجربے پر انحصار رکھتا ہے اسواسطے ہم مختصر طور پر یہ بیان کردیتے ہیں کہ تبادلات خارجی اس طریق عمل کا نام ہے جس کی وساطت سے قومیں ایک دوسری کا قرض ادا کرتی ہیں۔ قدیم زمانے میں جب ایک ملک کے سوداگر کسی دوسرے ملک کے سوداگروں کے قرضخواہ ہوا کرتے تھے تو مقروض ملک سے قرضخواہ ملک

کے درمیان مساوات قائم نہیں رہتی کیونکہ اسکو نہ صرف اپنی درآمد کے عوض میں اشیاء بھیجنی پڑتی ہیں بلکہ اپنے قرض کی ادائگی میں یا تو اپنی اشیاء برآمد میں زیادتی کرنی پڑتی ہے یا مزید روپیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے ایک ملک میں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۵ - کی طرف زر مسکوک ارسال کرنا پڑتا تھا مگر اب یہ وقت مفقود ہوگئی ہے کیونکہ باہمی ہنڈیوں کے استعمال سے زرِ نقد کے استعمال کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی زمانۂ حال میں تبادلے سے مراد کسی اور ملک میں زر نقد کی ایک خاص مقدار وصول کرنیکا حق ہے۔ جسکا اظہار ایک دستاویز کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر فرض کرو کہ کلکتہ کے ایک سوداگر نے دس ہزار روپیہ کا مال ولایت کے ایک سوداگر سے خریدا ہے اور ولایت کا ایک اور سوداگر کسی ہندوستانی سوداگر کا مقروض ہے۔ مذکورہ بالا طریق عمل کے رو سے کلکتہ کا سوداگر اپنے ہم وطن ہندوستانی سوداگر سے روپیہ وصول کرلیگا اور ولایت کا مقروض سوداگر اپنے ہم وطن قرضخواہ سوداگر کو رقم مذکور ادا کردیگا۔ اس طرح دونوں ملکوں کا حساب بغیر ترسیل زر کے بے باق ہوجائیگا۔ لیکن اگر کسی ملک کے سوداگر کے ذمہ کچھ باقی رہ جائے تو وہ زر نقد کی صورت میں ادا کرنا پڑے گا۔ موجودہ تجارتی نظام میں باقی ادا کرنے کی یہ ذراسی دقت بھی نہیں رہی کیونکہ شہر لنڈن انگریزی قوم کی تجارتی حیثیت کی وجہ سے دنیا کا تبادلہ گاہ بن گیا ہے۔ جسکی معرفت دنیا کی قومیں اپنا حساب کتاب فیصلہ کرلیتی ہیں۔ مثلاً اگر صوبجات متحدہ امریکا انگلستان کے قرضخواہ ہوں اور دیگر ممالک کے مقروض ہوں تو انگلستان کے دار السلطنت کی معرفت فیصلہ کرنے سے ممکن ہے کہ ترسیلِ زر کی نوبت بچ آئے کیونکہ ممکن ہے کہ یہ دیگر ممالک جو صوبجات متحدہ امریکہ کے قرضخواہ ہیں خود انگلستان کے مقروض ہوں۔ مگر باوجود اسکے ممکن ہے کہ بعض اقتصادی اسباب کا اثر اس امر کا مقتضی ہو کہ شہر لنڈن سے زر مسکوک کی مقدار رفتہ رفتہ خارج ہوکر کم ہوتی جا[ئے] ان اسباب کے اثر کو روکنے کے لئے انگلستان کے بنک شرح سود کو زیادہ کر دیتا ہے اور وہاں کی دیگر بنک اسکی تقلید کرتے ہیں جس سے انگلستان میں شرح سود بالعموم متاثر ہوجاتی ہے اور دیگر ممالک کے قرضخواہوں کو اس بات [illegible]

روپیہ کی مقدار بڑھتی جاتی ہے اور دوسری میں کم ہوتی جاتی ہے جہاں روپے کی مقدار بڑھتی ہے وہاں اس کی قدر کم ہوتی ہے اور اشیاء کی قیمت بڑھتی ہے - لہذا وہاں اشیاء کی فروخت سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے - یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی برآمد اسکی درآمد سے بہت زیادہ ہے چونکہ ہم اپنی ضروریات کے لئے انگلستان کے محتاج ہیں اسواسطے ہم زیربار ہیں - علاوہ اسکے ہم کو سلطنت ہند کے مصارف حکام کی تنخواہیں اور فوجی اخراجات وغیرہ ادا کرنے پڑتے ہیں - لہذا ہمارا ملک دن بدن زیادہ سے زیادہ زیربار ہوجاتا ہے - مزید براں ہمارے ملک میں کئی وجوہ کے باعث (مثلاً خارجی حملہ آوروں کا ہندوستان کی قدیم جمع کردہ دولت کو لوٹکر لے جانا تاخیر کے مغلیہ بادشاہوں کی عیاشی عوام کی ناعاقبت اندیشی اور کمی تعلیم کی وجہ سے روپیہ کی اصل حقیقت سے بیخبری وغیرہ) سرمائے کی مقدار کم ہے - انگلستان کے قبضے میں سرمائے کی بے انتہا مقدار ہے اسواسطے ہمارے ہیں رفاہِ عام کے کاموں مثلاً آبپاشی وغیرہ میں بھی اس ملک کا سرمایہ صرف ہوتا ہے جس سے انگلستان فائدۂ عظیم اٹھاتا ہے اگرچہ ہم کو بھی اس سے فائدہ پہونچا ہے جس کی تشریح اس کتاب کے کسی اور باب میں کی گئی ہے -

چونکہ انگلستان کے مصارف ہمیں پونڈوں میں ادا کرنے پڑتے ہیں اسواسطے چاندی کی قدر میں تنزل آجانے کی وجہ سے ہمیں اور بھی نقصان ہوا کرتا تھا لیکن اب اجرائے سکۂ طلائی کے باعث اس مشکل کا اندیشہ نہیں رہا مگر ہمارے نقصان کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ملک صنعت و حرفت کے میدان میں بہت پیچھے ہے اور اہل ملک بسبب کمی تعلیم کے اس ضرورت کو محسوس نہیں کر سکتے -

تتمہ حاشیہ صفحہ ۱۰۶ - وہ زیادہ شرح سود لینے کی غرض سے اپنا روپیہ انگلستان میں ہی جمع کر دیں +

ہم صرف وہی اشیاء پیدا کرتے ہیں جو قانون تقلیل حاصل کے زیر اثر ہیں اور صنعتی اشیاء کے لئے دیگر ممالک کے محتاج ہیں۔ گذشتہ چند سالوں سے ہم نے جاپان کی تقلید کر کے صنعت کی طرف کچھ توجہ کی ہے۔ امید ہے کہ یہ تحریک نہایت مفید ثابت ہوگی اور اہل ملک کے لئے ہر پہلو سے نتیجہ خیز ہوگی۔ اگرچہ ہم فی الحال اس قابل تو نہیں کہ ہمارے ملک کی تیار کردہ اشیاء یورپ کے بازاروں میں بک سکیں تو ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے ہندوستانی بھائی بارہ لاکھ کے قریب مختلف بیرونی جزائر مثلاً ماریشس گائنا فیجی ٹرینیڈاڈ وغیرہ میں آباد ہیں جن کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کرنے سے ہمارے ملک کے تاجر بے انتہا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

باب سوئم

زرِ نقد کی ماہیت اور اسکی قدر

تبادلہ اشیاء انقسامِ محنت کا لازمی نتیجہ ہے۔ مختلف ممالک بالعموم وہی اشیاء پیدا کرتے ہیں جن کی پیدائش کے لئے اُن کی آب ہوا اور دیگر حالات بالخصوص موزون ہوتے ہیں اور اپنی ذاتی ضرورت کی چیزیں ان اشیاء کے تبادلے میں دیگر ممالک سے حاصل کر لیتے ہیں۔ اس قسم کے تبادلے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اشیاء کی قدر کا ایک خاص معیار معین کیا جائے۔ کیونکہ محض مبادلے سے کام نہیں چل سکتا۔ اگر کسی کفش ساز کو ٹوپی کی ضرورت ہو تو ظاہر ہے کہ اسے کسی ایسے کلاہ ساز کی تلاش کرنی چاہئے جسکو جوتی کی ضرورت ہو ورنہ اسکی ضرورت کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ لہٰذا کسی خاص شے کا تعین بطور معیار قدر کے ضروری ہے جسکو ہر فرد تبادلے میں قبول کر سکے۔ مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں اس غرض کے لئے مختلف اشیاء استعمال کی گئی ہیں مثلاً نمک چاول چاء وغیرہ مگر چونکہ ان کے استعمال میں صدہا دقتیں تھیں اسواسطے ضرورت نے خود بخود ایک ایسی شے دریافت کر لی جو اس غرض کو بوجہ احسن پورا کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس غرض کو پورا کر سکنے کے لئے کوئی اس قسم کی شے ہونی چاہئے جو

(۱) ذاتی قدر رکھتی ہو۔

(۲) آسانی سے منتقل ہو سکتی ہو۔

(۳) پرانی ہو جانے سے اسکی قدر میں تغیر نہ آ سکتا ہو۔

(۴) چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہو سکتی ہو۔

(۵) تھوڑی مقدار میں قدر زیادہ رکھتی ہو۔

(۶) اسکی قدر بالعموم یکساں رہتی ہو۔

(۷) اسکا کھرا کھوٹا ہونا جلدی پرکھا جا سکتا ہو۔

(۸) اس کے سکے آسانی سے بن سکتے ہوں۔

غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ یہ تمام اوصاف بطریق احسن چاندی اور سونے میں پائے جاتے ہیں لہذا دنیا کی مہذب قوموں نے انہی دو دھاتوں کو بطور معیار قدر کے اختیار کر لیا جس سے تبادلے کی دقتیں مفقود ہو گئیں۔ ذرا خیال تو کرو اگر حروف نہ ہوتے تو خیالات انسانی کے اظہار میں کس قدر دقت ہوتی۔ سونے چاندی کو اشیاء سے وہی علاقہ ہے جو حروف کو ہمارے خیالات سے ہے۔ لہذا اس معیار کا دریافت ہونا تمدن انسانی کی تاریخ میں ایجاد حروف سے کم وقعت نہیں رکھتا۔

فرض کرو کسی شراب فروش کو روٹی کی ضرورت ہے اور وہ ایک نان فروش سے کہتا ہے کہ مجھ سے شراب لے لو اور مبادلے میں مجھے روٹی دیدو مگر ممکن ہے کہ نان فروش کو یا تو شراب کی ضرورت ہی نہ ہو یا اگر ہو تو اتنے شراب کی ضرورت نہ ہو جسکی قدر روٹی کی قدر کے مساوی ہو۔ شراب فروش روٹی لے لیتا ہے اور مبادلے میں نان فروش کو اس قدر شراب دیدیتا ہے جسقدر کہ اسکو ضرورت ہے اور بقایا حساب کو بے باق کرنے کے لئے مذکورہ بالا معیار قدر کی کچھ مقدار ادا کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر نان فروش کو

شراب کی مطلق ضرورت نہ ہوتی تو شراب فروش کو معیار قدر کی زیادہ مقدار ادا کرنی پڑتی۔ اب فرض کرو کہ نان فروش کو شراب کی مطلق ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے کپڑے کی ضرورت ہے معیار قدر کی وہ مقدار جو اس نے شراب فروش سے حاصل کی ہے جیب میں ڈال کر بزاز کی دکان پر جاتا ہے اور وہاں سے وہ شے حاصل کرتا ہے جس کی قدر اس روٹی کی قدر کے مساوی ہے جو اس نے شراب فروش کے پاس فروخت کی تھی یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ جو شے اسکو شراب فروش کی طرف سے واجب الادا تھی وہ بزاز نے مہیا کر دی۔ لفظ واجب الادا پر ذرا غور کرو کیونکہ اسی لفظ میں زر نقد کی پوری حقیقت یا ماہیت مخفی ہے۔ مثال بالا سے واضح ہوتا ہے کہ جب مبادلہ غیر مساوی ہو تو معیار قدر یا زر نقد کی ضرورت پڑتی ہے گویا زر نقد یا معیار قدر اس حق کی علامت ہے جو مبادلہ غیر مساوی کی صورت میں ایک فریق کو دوسرے فریق پر حاصل ہے۔ زمانہ حال میں اس معیار قدر کو زر نقد سے تعبیر کرتے ہیں اور دنیا کی تمام مہذب اقوام نے اس کو اس قسم کے حقوق کی علامت قرار دیا ہے پس زر نقد اس حق کی علامت ہے جو اس شخص کو حاصل ہے جس نے کسی اور شخص کو کوئی شے دی ہے یا اسکی کوئی خدمت کی ہے اور اپنی خدمت یا شے کے مبادلے میں شخص مذکور سے کوئی مساوی القدر شے حاصل نہیں کی یا کوئی مساوی القدر خدمت نہیں لی۔ اس تعریف سے یہ اصول قائم ہوتا ہے کہ زر نقد کی وہ مقدار جو کسی ملک میں متداول ہو حقوق کی اس مقدار کی علامت ہے جو زر نقد کی عدم موجودگی کی صورت میں اس ملک کے درمیان واجب الاداء ہوتے یا بطور نتیجہ یوں کہو کہ جس ملک میں یہ حقوق نہیں ہیں وہاں کسی معیار قدر کے تداول کی ضرورت نہیں ہے۔

زرِ نقد کی ماہیت کی مزید توضیح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اعتبار یا ساکھ کے ساتھ اسکا مقابلہ کریں۔ ساکھ کیا ہے؟ فرض کرو کہ مجھے ایک شے کی ضرورت ہے لیکن اس کی خرید کے لئے میرے پاس روپیہ موجود نہیں ہے، اگر اس شے کے بیچنے والوں کی نگاہوں میں میں ایک معتبر آدمی ہوں تو وہ لوگ میرے اعتبار پر مجکو میری ضرورت کی چیز دیدینگے گویا میں اپنے اعتبار کی وساطت سے وہ شے حاصل کرلونگا جو زرِ نقد کی وساطت سے حاصل ہوتی۔ بالفاظِ دیگر یوں کہدو کہ وعدہ ادائگی بھی وہی کام دے سکتا ہے جو زرِ نقد دیتا ہے، جس طرح زرِ نقد کی ادائگی ایک قسم کے حق کا تحویل کرنا ہے اسی طرح اعتبار کی وساطت سے اشیاء ضرورت کا حاصل کرنا بھی ایک حق کا تحویل کرنا ہے یعنی جس شخص سے میںنے کوئی شے اعتبار پر لی ہے اگر عند الطلب یا کسی معینہ میعاد کے بعد اسکو کوئی مساوی القدر شے اس شے کے تبادلے یا مبادلے میں نہ دونگا تو اس شخص کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ قانونی چارہ جوئی کرکے مجھسے وہ رقم یا شے وصول کرلے۔ مختصراً یوں کہو کہ زرِ نقد کی طرح اعتبار بھی قوت خرید کا نام ہے اور دونوں ایک قسم کے حقوق ہیں۔ اس تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ زرِ نقد اور اعتبار کی ماہیت ایک ہی ہے اور زرِ نقد اعتبار ہی کی ایک وسیع اور عامتر صورت کا نام ہے لیکن باوجود اس امر کے ان کے درمیان ایک باریک فرق ہے جسکا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ علم الاقتصاد میں تمام زرِ نقد اعتبار ہے لیکن اس قضیئے کا عکس سادہ یعنی تمام اعتبار زرِ نقد ہے صحیح نہیں ہے۔ کوئی شخص کسی دکاندار کو اس بات پر مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ کسی شے کو زرِ نقد کے عوض میں یا اعتبار پر فروخت کرے۔ پس جب کوئی شخص کسی شے کے عوض میں زرِ نقد یا روپیہ کی کوئی مقدار لیتا ہے تو حقیقت

میں یہ اعتباری کی ایک صورت ہوتی ہے کیونکہ اگر اسے یقین نہ ہو کہ میں اس زرِ نقد کے عوض میں اور اشیاء لے سکونگا تو وہ اس زرِ نقد کو بھی قبول نہ کرے۔ مگر فرض کرو کہ ایک سودا ہوا ہے یعنی ایک شخص نے کسی دوسرے شخص سے کوئی شے قرض خریدی ہے۔ عدل اس امر کا متقاضی ہے کہ مقروض کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ اپنے قرضخواہ کو اپنے قرض کی ادائگی میں کوئی شے قبول کرنے پر مجبور کر سکے۔ اگر قرضخواہوں کو یہ اختیار ہوتا کہ اپنے قرضوں کی ادائگی میں جو شے چاہیں قبول کریں تو خیال کرو کسقدر دقت کا سامنا ہوتا۔ پس ہر ملک کا قانون یہ اصول وضع کرتا ہے کہ اگر کسی نے کچھ قرض لیا ہو تو مقروض اپنے قرض کی ادائگی میں اپنے قرضخواہ کو کوئی خاص شے قبول کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ یہ خاص شے جسکو ادائی قرض کی صورت میں مقروض قرض خواہ کو قبول کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ اصطلاحاً نقد قانونی کہلاتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ ظاہر ہے کہ بعض صورتوں میں بعض اشیاء نقد قانونی ہیں اور بعض میں نہیں۔ انگلستان میں سکۂ طلائی ہر صورت میں نقد قانونی ہے۔ لیکن چاندی کا سکہ صرف ۴۰ شلنگ تک ہی نقد قانونی ہے۔ یعنی اگر قرض ۴۰ شلنگ سے زیادہ ہو تو قرضخواہ کو اختیار ہے کہ اس سکے کو قبول نہ کرے۔ اگر اس سے کم ہو تو مقروض اسے قانوناً مجبور کر سکتا ہے کہ وہ سکۂ سیمین کو اپنے قرض کی ادائگی میں قبول کرے۔ مندرجہ بالا تحقیقات سے واضح ہوتا ہے کہ زرِ نقد تجارتِ اقوام میں تین ضروری مقاصد کو پورا کرتا ہے:-

(۱) تبادلۂ اشیاء کا ایک وسیلہ ہے۔ جوں جوں تجارتِ اقوام زیادہ پیچیدہ صورتیں اختیار کرتی جاتی ہے توں توں زرِ نقد کے استعمال کا یہ مقصد زیادہ واضح و نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں

تبادلۂ اشیاء کے لئے اسکا وجود ایسا ہی ضروری ہے جیسا اظہارِ خیالات کے لئے زبان کا استعمال ۔ تمام ملکوں میں ٹکسالیں قائم ہیں جہاں ارکانِ سلطنت کے اہتمام سے سونے چاندی کے سکے بنائے جاتے ہیں اور ان کی ہر دو طرف وہاں کے شاہی نشانات وغیرہ لگائے جاتے ہیں اور ان سکوں کے بل پر دنیا کی تجارت کا دھندا چلتا ہے ۔

(۲) زرِ نقد کا دوسرا مقصد پہلے مقصد سے بطورِ نتیجہ کے پیدا ہوتا ہے یعنی یہ اشیاء کی قدر کا معیار ہے لیکن یہاں ایک اور ضروری سوال پیدا ہوتا ہے یعنی زرِ نقد کی ذاتی قدر کس امر پر منحصر ہے ؟ اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ ہم اصطلاح "زرِ نقد کی قدر" کا مفہوم ذہن نشین کرلیں کیونکہ مِل صاحب نے اس اصطلاح کے سمجھنے میں ایک غلطی کھائی ہے جو اوروں کو بھی دھوکے میں ڈال سکتی ہے ۔ تم کو معلوم ہے کسی شے کی قیمت سے مراد اس شے کی قدر سے ہے جسکا اندازہ زرِ نقد یا اعتبار سے کیا جاتا ہے پس زرِ نقد کی قدر سے مراد کسی اور شے کی مقدار سے ہے جو اس زرِ نقد کے عوض میں دی جائے ۔ مثلاً کوئی مادی شے یا خدمتِ ملازمین یا کوئی اور حقِ ملکیت کا یا کوئی قرضہ وصول کرنے کا ۔ اگر زرِ نقد کی ایک خاص مقدار کے عوض میں کسی شے کی بہت سی مقدار ملے تو ظاہر ہے کہ زرِ نقد کی قدر زیادہ ہے ۔ کیونکہ اس کے عوض میں دیگر اشیاء کی زیادہ مقدار حاصل ہوتی ہے ۔ لیکن اگر اس کے عوض میں دیگر اشیاء کی کم مقدار حاصل ہو تو ظاہر ہے کہ زرِ نقد کی قدر کم ہے ۔ پس معلوم ہوا کہ زرِ نقد کی قدر اور قیمت اشیاء کے درمیان نسبت معکوس ہے یعنی اگر زرِ نقد کی قدر زیادہ ہو تو قیمت اشیاء کم ہوتی ہے اور اگر قیمت اشیاء زیادہ ہو تو زرِ نقد

کی قدر کم ہوتی ہے۔ لیکن مادی اشیاء کی طرح حقوق (مثلاً کسی شخص سے کوئی خاص رقم وصول کرنے کا حق وغیرہ) قرضے؎ اور اعتبارات بھی تجارت کے دائرہ میں لائے جاسکتے ہیں۔ مثلاً فرض کرو کہ الف نے ب سے پانچ سو روپے قرض لئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ج الف کو پانچ سو روپے سے کچھ کم رقم ادا کر کے اس سے حق وصولی قرضہ خرید لیوے۔ اور میعاد مقررہ کے بعد یا عند الطلب ب سے پانچسو روپے وصول کر لیوے۔ لہذا ان حقوق اور اعتبارات کی خرید و فروخت کے لئے بھی ویسا ہی پیمانہ مقرر ہے جیسا مادی اشیاء کی خرید و فروخت کے لئے۔ جیسے غلہ کے لئے من کا پیمانہ کپڑے کے لئے گز کا اسی طرح سہولت کے لئے زر نامسکوک کو بھی مختلف پیمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جنکو سکے کہتے ہیں۔ علی ہذالقیاس قرضوں اور اعتبارات کی خرید و فروخت کے لئے بھی ایک پیمانہ مقرر ہے۔ یعنی مبلغ سو روپے وصول کرنے کا حق جواب سے ایک سال بعد واجب الادا ہوگا۔ زرِ نقد کی وہ مقدار جو کسی قرض کا ایک پیمانہ خریدنے کے لئے ادا کی جائے اس پیمانے کی قیمت نقد کہلاتی ہے اور اسکی خرید و فروخت کا بھی وہی حال ہے جو اور اشیاء کا یعنی ایک پیمانہ قرض خرید کرنے کے لئے زرِ نقد کی مقدار یا قیمتِ نقد جسقدر کم ادا کرنی پڑے گی اسی قدر زرِ نقد کی قدر زیادہ ہوگی اور جسقدر زیادہ دینی پڑے گی اسی قدر اسکی قدر کم ہوگی۔ غرض کہ

؎ یاد رکھنا چاہئے کہ قرض سے مراد کوئی خاص رقم یا زر نقد کی مقدار نہیں ہے جیسا کہ عوام خیال کرتے ہیں بلکہ علمی لحاظ سے اس لفظ کا مفہوم وہ حق طلب ہے جو قرضخواہ کو بحال ہو یا وہ فرض ادائگی ہے جو مقروض کے ذمے ہے لہذا قرضوں کی خرید و فروخت سے مراد قرضخواہ یا مقروض کے حق طلب یا فرض ادائگی کی خرید و فروخت سے ہے۔

قرضوں اور دیگر حقوق کی خرید و فروخت میں بھی مندرجہ بالا اصول ہی صحیح ہے یعنی زرِ نقد کی قدر اور قیمت اشیاء کے درمیان نسبت معکوس ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ قرضوں کی خرید و فروخت کی صورت میں عموماً زر نقد کی قدر کا اندازہ قرضے کے اس مقدار سے نہیں کیا جاتا جو اس کے عوض میں خرید کیا جا سکے چونکہ زرِ نقد قدرتاً منافع پیدا کرتا ہے اسواسطے ظاہر ہے کہ کسی ایسے قرضے کی قیمت نقد جواب سے ایک سال بعد واجب الادا ہوگا اس قرضے کی اصل مقدار سے کم ہونی چاہئے ورنہ خریدنے والے کو فائدہ ہی کیا ہوگا۔ پس زر نقد کی قدر موجودہ یا قیمت نقد منفی اصل زر یا مقدار قرضہ برابر اس منافع کے ہے جو اس قرضے کے خریدنے سے ہوتا ہے۔ اس فرق کو مٹی کاٹا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اب صاف ظاہر ہے کہ جسقدر کسی قرضے کی قیمت نقد بڑھتی یا کم ہوتی ہے اسی قدر مٹی کاٹا بھی کم ہوتا یا بڑھتا ہے لہذا قرضوں کی خرید و فروخت کے متعلق یہ اصول قائم ہوا کہ زر نقد کی قدر اور مٹی کاٹے کے درمیان نسبت مستقیم ہے یعنی قیمت نقد کم ہو تو مٹی کاٹا زیادہ ہوگا اور اگر قیمت نقد زیادہ ہو تو مٹی کاٹا کم ہوگا۔ پس مندرجہ ذیل اصول تجارت کی سب شاخوں یعنی قرضوں اور دیگر حقوق کی خرید و فروخت اور اشیاء مادیہ کی خرید و فروخت پر حاوی ہے:

زرِ نقد کی قدر قیمت اشیاء کے ساتھ نسبت معکوس رکھتی ہے اور مٹی کاٹا کے ساتھ نسبت مستقیم۔

اب تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اصطلاح زر نقد کی قدر کے دو مفہوم ہیں جب اشیاء مادیہ اور حقوق وغیرہ کی خرید و فروخت میں تو اس سے مراد قیمت شے یا حق وغیرہ کی ... مقدار سے ہے جو ... کے عوض میں ... حاصل کی جا سکے اور قرضوں

کی خرید و فروخت میں اسکا مفہوم وہ منی کاٹا یا سنافع ہے جو کسی شخص کو کوئی قرضہ خریدنے سے حاصل ہو۔

اِس توضیح کے بعد ہم اپنے اصل سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اسی سوال کی وجہ سے زرِ نقد کی بحث تبادلہ کی ذیل میں آتی ہے ورنہ دیگر اشیاء کی طرح اسکا ذکر بھی بابِ پیدائش دولت میں کیا جاتا۔ صاف ظاہر ہے کہ زرِ نقد کی قدر دیگر اشیاء کی قدر کی طرح قانونِ طلب و رسد کے عمل سے متعین ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو دنیا کی تجارت زرِ نقد کے بل پر ہی چلتی ہے پس جسقدر استعمال زرِ نقد کے مواقع زیادہ ہوں گے اسی قدر اس کی مانگ یا طلب بھی زیادہ ہوگی۔ ہاں جب زرِ نقد کا کام اور وسائل سے لیا جائے مثلاً چکوں وغیرہ سے تو اسکی طلب کم ہو جاتی ہے وجہ یہ ہے کہ زرِ کاغذی کا استعمال زرِ نقد کے مواقع استعمال کو کم کرتا ہے۔ کہیں اس غلطی میں نہ پڑ جانا کہ زرِ نقد کی مانگ یا طلب کا انحصار کسی قوم کی دولت یا اسکی سالانہ پیداوار دولت کی مقدار پر انحصار رکھتا ہے کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر قسم کی دولت تبادلے کے دائرے میں آوے۔ علیٰ ہذالقیاس اشیاء متبادلہ کی مقدار کو بھی اس مانگ سے کچھ واسطہ نہیں ہے کیونکہ بعض اشیاء کا تبادلہ صرف ایک ہی دفعہ ہوتا ہے۔ اور بعض کا کئی کئی دفعہ ہوتا ہے۔ مزید براں خصوصاً زراعتی ملکوں میں بسا اوقات افراد اپنا کام زرِ نقد کی وساطت کی بغیر مبادلۂ اشیاء سے ہی چلا لیتے ہیں۔ تم شاید یہ کہو گے کہ جب کسی ملک کا سکہ کھوٹا ہو کر یا کسی اور وجہ سے کم حیثیت ہو کر اپنا اعتبار کھو بیٹھتا ہے تو وہاں کے لوگ اس سکے سے احتراز کرنے کی خاطر مبادلۂ اشیاء سے کام چلا لیتے ہیں یا ضرورت کی اشیاء ایک دوسرے سے بدل کر سکوں کی استعمال سی بچ جاتے ہیں

یہ خیال صحیح ہے مگر کسی ملک میں یہاں تک نوبت نہیں پہنچ سکتی کہ زرِ نقد کا استعمال بالکل جاتا رہے۔ ہر ملک میں بشرطیکہ وہاں کے لوگ وحشی نہ ہوں کچھ نہ کچھ بطور زرِ نقد کے ضرور مستعمل ہوتا ہے۔ پس زرِ نقد کی طلب کسی قوم کی دولت یا اس کی پیداوار دولت یا اشیاء متبادلہ کی مقدار سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ اسکا انحصار زرِ نقد کے مواقع استعمال پر ہے جو خود مختلف ممالک کی تنظیم محنت اور دیگر حالات پر منحصر ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہئے کہ زرِ نقد کی مانگ یا طلب محض خیالی امر ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ تم دیکھتے ہو لوگ روپے کے عوض میں اپنی اشیاء فروخت کرتے ہیں۔ چیزیں دیتے ہیں اور ان کے عوض میں زرِ نقد قبول کرتے ہیں۔ رسد اشیاء کی ایک معین مقدار کی صورت میں جسقدر زیادہ اشیاء زرِ نقد کے عوض میں ملینگی اسی قدر زرِ نقد کی قدر زیادہ ہو گی یا یوں کہو کہ اشیاء کی قیمتیں کم ہوں گی اور جسقدر کم اشیاء زرِ نقد کے عوض میں ملینگی اسی قدر زرِ نقد کی قدر کم ہو گی یا یوں کہو کہ اشیاء کی قیمتیں زیادہ ہو جائینگی۔

زرِ نقد کی رسد گویا ایک قسم کی قوت ہے جو زرِ نقد کے تجارتی مقاصد کو پورا کرتی ہے اور جو اسکی مقدار اور سرعت انتقال سے متاثر ہوتی ہے۔ جسقدر زرِ نقد کی مقدار زیادہ ہو گی اور جس قدر عجلت سے یہ مقدار دست بدست پھر سکیگی اسی قدر تجارتی مقاصد بحسن وجوہ اتمام پائینگے۔ اگر زرِ نقد کی رسد کم ہو جائے تو اشیاء کی قیمتیں کم ہو جائینگی کیونکہ رسد کی کمی سے زرِ نقد کی قدر بڑھ جائیگی۔ علیٰ ہذا القیاس اگر رسد زیادہ ہو جائے تو اشیاء کی قیمتیں زیادہ ہو جائینگی کیونکہ اس صورت میں زرِ نقد کی قدر کم ہو جائیگی اور اس کے عوض میں اشیاء کی زیادہ مقدار ہاتھ لگے گی۔

اب ہم زرِ نقد کے متعلق ایک اور ضروری امر دریافت کرنا چاہتے ہیں یعنی مختلف ممالک اور اقوام کے درمیان زرِ نقد کی مساوی تقسیم کس طرح ہوتی ہے؟ زرِ نقد خود بخود ایک ملک سے دیگر ممالک میں منتقل ہوتا ہے اور اِس وجہ سے اس کی تقسیم مساوی طور پر ہو جاتی ہے۔ فرض کرو کہ کسی ملک (الف) میں زرِ نقد کی مقدار وہاں کے لوگوں کی ضرورتوں سے زیادہ ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہاں اشیاء کی قیمتیں بڑھ جائینگی کیونکہ زرِ نقد کی زیادتی سے اس کی قدر کم ہو جائے گی اس صورت میں ب اپنی اشیاء ملک الف میں بھیجیگا کیونکہ وہاں قیمتوں کی زیادتی کی وجہ سے فائدے کی توقع ہے۔ اس طریق سے زرِ نقد ملک الف سے ملک ب کی طرف منتقل ہوتا جائے گا یہاں تک کہ دونوں ملکوں میں اس کی مقدار مساوی ہو جائیگی۔ لیکن ملک الف میں زرِ نقد کی افراط کی وجہ سے ایک اور نتیجہ بھی پیدا ہوگا یعنی چونکہ اس کی قدر افراط کی سبب سے کم ہو گی۔ اسواسطے عام لوگوں کو زرِ نقد کی جمع کرنے کی تحریک ہو گی مختلف اقسام کی صنعتوں میں چاندی یا سونے کا استعمال (جیسی صورت ہو) بڑھتا جائیگا۔ چاندی کے گلاس حقول کے منہالیں وغیرہ عام ہو جائینگی مزید براں وہاں کے لوگ سکوں کو پگھلا کر زرِ نامسکوک کی صورت میں ان ممالک کی طرف بھیجنا شروع کر دینگے جہاں سونے چاندی کی قدر زیادہ ہے۔ ایسے حالات میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر فرضاً ملک الف میں کھرے سکے کے ساتھ ایک کھوٹا یا کم وزن کا سکہ بھی جاری ہو۔ (تم جانتے ہو مختلف ممالک کے سکوں میں کم و بیش اختلاف ہوتا ہے اکثر سکے استعمال سے ہلکے ہو جاتے ہیں۔) تو ان دونوں میں سے کس سکے کو جمع کرنے یا پگھلانے یا دیگر ممالک میں بھیجنے کی تحریک

ہوگی ؟ چونکہ اس ملک میں زرِ نقد کی افراط ہم نے فرض کر لی ہے اسواسطے ظاہر ہے کہ جو سکہ کھرا یا پورے وزن کا ہوگا لوگ اسی کو جمع کرینگے یا پگھلا کر دیگر ممالک میں بھیجینگے۔ کھوٹے یا کم وزن سکوں کی نسبت خالص اور پورے وزن کے سکوں کا جمع کرنا یا دیگر ممالک کو بھیجنا زیادہ فائدہ مند ہوگا کیونکہ دیگر ممالک میں سکوں کی قدر دھات کی اس مقدار سے متعین ہوتی ہے جو ان میں شامل ہو۔ اسی صداقت کو گریشم صاحب ایک اقتصادی اصول کی صورت میں یوں پیش کرتے ہیں کہ کھوٹا یا ہلکا سکہ کھرے سکے کو دائرہ استعمال سے خارج کر دیتا ہے اور خود اس کی جگہ لے لیتا ہے۔

مگر یاد رکھنا چاہئے کہ یہ اصول اسی صورت میں صادق آئیگا جبکہ کسی ملک میں زرِ نقد کی مقدار لوگوں کی ضروریات سے زیادہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہلکے یا کھوٹے سکوں اور کھرے سکوں کی قوتِ خرید میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

یہ کلیہ اصول مندرجہ ذیل حالات پر صادق آتا ہے :-

(۱) اگر کسی ملک میں صرف ایک دھات سونے یا چاندی کا کھرا سکہ متداول ہو اور اس کے ساتھ کوئی مغشوش کھوٹا یا ہلکا سکہ بھی متداول رہنے دیا جائے تو کچھ عرصے میں کھرے سکے کی تمام مقدار دائرہ استعمال سے خارج ہو جائے گی اور صرف کھوٹا سکہ ہی استعمال میں رہے گا۔ کھرے سکے کو یا تو لوگ جمع کرتے جائینگے یا پگھلا کر رکھتے جائینگے۔ یا دیگر ممالک سے اشیاء ضرورت کے خریدنے میں صرف کرتے جائینگے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی ملک میں گز کے دو پیمانے جاری ہوں ایک تین فٹ اور ایک دو فٹ کا تو کپڑے کے دکاندار قدرتاً ۲ فٹ والے پیمانے کے حساب سے اپنا کپڑا فروخت کرینگے یعنی ۲ فٹ والا گز تین فٹ والے گز کو دائرہ استعمال

سے خارج کر دیگا۔

(ب) اگر کسی ایک ملک میں دو مختلف دھاتوں مثلاً سونے اور چاندی کے سکے ایک غیر محدود مقدار میں اکٹھے متداول ہوں اور قانونی طور پر ان کے درمیان ایک ایسی نسبت مقرر کر دی جائے جو ان کی حقیقی قدروں کی درمیانی نسبت سے مختلف ہو (یعنی کم یا زیادہ ہو) تو جس سکے کی قدر اس کی حقیقی قدر سے کم ہو گی وہ دائرۂ استعمال سے خارج ہو جائیگا اور جسکی زیادہ ہو گی وہی متداول رہے گا۔ مثال کے طور پر فرض کرو کہ ایک ملک میں دو سکے غیر محدود مقدار میں متداول ہیں ایک سونے کی مہر اور دوسرا چاندی کا روپیہ اور ان کی اضافی قدر اس طرح پر ہے کہ ایک مہر مساوی بیس روپے کے ہے۔ نیز فرض کرو کہ مہر کی قانونی قدر بیس روپیہ ہے یا بالفاظ دیگر بیس روپے کو چلتی ہے لیکن اس میں سونا اٹھارہ روپیہ کا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس چاندی کے روپے کی قانونی قدر اسکی حقیقی قدر سے کم ہے تو اس صورت میں اصول مندرجہ بالا کے رو سے روپیہ کا سکہ دائرۂ استعمال سے خارج ہو جائیگا اور صرف مہر متداول رہیگی۔ لوگ اپنی خرید و فروخت اور قرضوں کی ادائگی قدر ًتا مہر کی وساطت سے کرینگے کیونکہ اس کی اصل قدر تو اٹھارہ روپیہ ہے اور کام میں زیادہ کا دیتی ہے۔ چاندی کے سکوں کو لوگ پگھلا کر زر ناسکوک کی صورت میں جمع کرینگے یا دیگر ممالک میں بھیجینگے کیونکہ ان کی قدر دھات کی اس مقدار سے متعین ہو گی جو ان میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سنہ ۱۷۶۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں چاندی کے سکے کے ساتھ سونے کا سکہ بھی جاری کیا تو اس کارروائی میں ناکامیابی ہوئی اور سکۂ مذکور چل نہ سکا کیونکہ کمپنی کی مہر کی قانونی قدر چودہ روپیہ کے برابر مقرر کی گئی تھی جو حقیقی قدر سے بہت کم تھی۔ سنہ ۱۷۶۹ء

یں کمپنی مذکورنے پھر ایک طلائی مہر جاری کی لیکن پھر ناکامی ہوئی - آخرکار یہ فیصلہ ہوا کہ بنگال میں صرف ایک ہی دھات کا سکہ متداول رہنا چاہیئے۔ اور اس غرض کے لئے چاندی انتخاب کی گئی - اب کچھ عرصہ سے سرکار ہند نے اس ملک میں سونے کا سکہ بھی متداول کر دیا ہے جسکی وجہ ابھی معلوم ہو گی -

(ج) مندرجہ بالا دو مقدمات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ایک ملک میں سونے کا سکہ متداول ہو اور دوسرے میں چاندی کا تو ان کے درمیان ایک ہی نسبت تبادلہ قائم نہیں رہ سکتی بلکہ چاندی اور سونے کی قیمت کے تغیر کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتی رہتی ہے - وجہ یہ ہے کہ سکے خواہ سونے کے ہوں خواہ چاندی کے ہوں خارجی ممالک میں اپنی حقیقی قدر کے لحاظ سے قبول کیے جاتے ہیں - ہمارے ملک کے روپے کی حقیقی قدر صرف ۱۱/ کے برابر ہے اگرچہ قانوناً اس کی قدر ۱۶/ کے برابر مقرر کی گئی ہے - ظاہر ہے کہ ہندوستان میں تو ہر شخص اسے ۱۶/ کے عوض میں قبول کرے گا لیکن کوئی وجہ نہیں کہ دیگر ممالک کے لوگ بھی اس کے عوض میں ۱۶/ ہی دیں وہ اس کے بدلے اس کی حقیقی قدر یعنی ۱۱/ ہی ادا کرینگے -

یہ کلیہ اصول جو ہم نے بیان کیا ہے علم الاقتصاد کی کتابوں میں قانون گریشم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس کے نتائج بڑے اہم ہیں اور یہ ایک بڑی ضروری اقتصادی بحث میں کام آتا ہے محققین کے درمیان یہ بحث مدت سے چلی آتی ہے کہ آیا تمام دنیا کے ممالک کو یا کسی ایک ملک کو ایک ہی دھات کا سکہ بطور معیار قدر کے متداول رکھنا چاہیئے یا اقتصادی لحاظ سے دو مختلف دھاتوں کے سکے بطور معیار قدر کے [illegible]

متداول رہ سکتے ہیں۔ ایک فریق تو یہ کہتا ہے کہ تمام ممالک یا کسی ایک ملک میں اصل معیار قدر تو ایک ہی رہنا چاہیئے جس سے سرکار اور تجارت کے بڑے بڑے معاملے طے ہوا کریں۔ لیکن روز کی معمولی چھوٹی چھوٹی خرید و فروخت کے لئے اور دھاتوں کے سکے متداول رہنے چاہئیں[۱]۔ دوسرا فریق یہ کہتا ہے کہ دو مختلف دھاتوں کے سکے بطور معیار قدر کے متداول رہ سکتے ہیں اور رہنے چاہئیں۔

اِس طریق عمل میں اقتصادی لحاظ سے کوئی نقصان نہیں ہے بشرطیکہ مختلف ممالک اتفاق کرکے دونوں دھاتوں کی اضافی قدروں کے درمیان ایک خاص نسبت مقرر کردیں۔ اس طویل مگر ضروری بحث کو ہم یہاں چھیڑنا نہیں چاہتے لیکن اسقدر ظاہر ہے کہ قانونِ مذکورہ بالا کے رو سے دونوں دھاتوں کی اضافی قدروں کے درمیان کوئی نسبت مقرر نہیں رہ سکتی بلکہ چاندی اور سونے کی قدروں کے تغیر کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتی رہتی ہے۔ تم شاید یہ کہوگے کہ سرکار ہند نے اِس صحیح اصول کے خلاف کیوں عمل کیا ہے یعنی ہندوستان میں کیوں دو معیار قدر جاری ہیں۔ اسکا جواب یہ ہے کہ سونے کا سکہ عام استعمال کے لئے نہیں ہے۔ ہم پہلے اشارۃً ذکر کر آئے ہیں کہ ہمیں انگلستان کو جو رقم سالانہ ادا کرنی پڑتی ہے وہ پونڈوں کے حساب سے دینی ہوتی ہے اسواسطے جب چاندی کی قدر میں کسی باعث سے کمی

---

[۱] یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی ملک میں دو یا دو سے زیادہ مختلف دھاتوں کے سکوں کا متداول ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ یہ سب سکے بطور معیار قدر کے مستعمل ہوتے ہیں۔ یہ تمام سکے معیار قدر اسی صورت میں سمجھے جائینگے جہاں رعایا کو یہ حق حاصل ہو کہ جب چاہے کسی دھات کی کچھ مقدار دیکر سرکاری ٹکسال سے متداول سکے بنوا لے۔

ہوجاتی تھی (بالعموم سونے کی نسبت چاندی کی قدر میں زیادہ تغیر آتے ہیں) تو ہمارے ملک کی مالگزاری کو نقصان پونچتا تھا کیونکہ جہاں پہلے ایک پونڈ کے عوض میں دس روپیہ دینے پڑتے تھے چاندی کی قدر کے کم ہو جانے کی وجہ سے ایک پونڈ کے عوض میں ۱۵ روپیہ دینے پڑتے تھے - اس کے علاوہ بڑے بڑے تاجروں کو بھی نقصان پونچتا تھا - اسی وقت کو محسوس کرکے ہماری سرکار نے یہاں بھی سونے کا سکہ جاری کر دیا ہے - چونکہ یہ سکہ عام طور پر مستعمل نہیں ہے اور ہو بھی کس طرح سکتا ہے کیونکہ اس ملک کے لوگ اس قدر غریب ہیں کہ یہاں کوڑیاں بھی بطور سکے کے مستعمل ہوتی ہیں اسواسطے ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ ہمارے ملک میں ایک ہی معیار قدر یعنی چاندی کا روپیہ جاری ہے - اس طریق عمل سے ہم ان نقصانات سے جو ایک ہی معیار قدر کے تداول سے پیدا ہوتے ہیں مامون ہیں - لیکن وہ بڑے بڑے فوائد جو دو معیار قدر کے تداول سے پیدا ہوتے ہیں ہمیں حاصل ہیں -

(۳) تیسرا مقصد نقد کا یہ ہے کہ نقد مذکور ادائگی غیر معجل کا معیار ہے - فرض کرو کہ الف اور ب نے آپس میں ایک معاہدہ کیا ہے - الف نے ب کو کسی قسم کا سامان دیا ہے اور ب اس کے عوض میں معاہدہ کرتا ہے کہ میں سال کے بعد دس ہزار روپیہ اس سامان کے عوض میں ادا کرونگا - فرض کرو کہ اس عرصہ میں روپیہ کی قدر میں ایک بہت بڑا تغیر آگیا ہے یعنی جو چیز معاہدہ کے وقت آٹھ آنے کو بکتی تھی اب ایک روپیہ کو ملتی ہے - صاف ظاہر ہے کہ قرض کی ادائگی میں الف گھاٹے میں رہیگا - اور ب بہت فائدہ میں - اس قسم کی اور صورتوں کے لحاظ سے بہ ضروری ہے کہ سیا

قدر کوئی ایسی شے ہونی چاہئے جسکی قدر میں تغیر نہ آتا ہو یا کمی بیشی نہ ہوتی ہو۔ ایسی شے تو شاید دنیا بھر میں کوئی نہ ملے ہاں بعض اشیاء کی قدر میں دیگر اشیاء کی نسبت کم تغیر آتا ہے ۔ انہیں میں سے سونا اور چاندی دو دھاتیں ہیں جو بالعموم اپنی قدر میں یکساں رہتی ہیں۔ اگرچہ بعض دفعہ ان کی قدر میں بھی تغیر ہو جانے سے دقتوں کا سامنا ہوا ہے تاہم نسبتاً ان کی قدر تغیر سے آزاد رہتی ہے لہٰذا یہ ان قرضوں کی ادائگی کی صورت میں بھی کام دے سکتے ہیں جن میں مدت کو دخل ہے۔ بعض محققین ان مشکلات سے بچنے کے لئے جو زرِ نقد کی قدر کے تغیر سے پیدا ہوتی ہیں یہ تجویز کرتے ہیں کہ ادائگی غیر معجل یا ایسی ادائگی کی صورت میں جس میں مدت کو دخل ہے معیار قدر غلہ کو قرار دینا چاہئے مگر یہ رائے قرینِ صواب نہیں معلوم ہوتی کیونکہ عام لوگوں کو سونے چاندی کے ساتھ ایک خاص قسم کا انس اور دلبستگی پیدا ہو گئی ہے جسکا دور کرنا مشکلات سے ہے۔ بعضوں نے ان مشکلات سے بچنے کی اور تجاویز بھی پیش کی ہیں جنکا اس کتاب میں بیان کرنا کچھ ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

باب چہارم

حق الضرب

اِس باب میں ہم ایک ایسے سوال پر بحث کرنا چاہتے ہیں جسکا فیصلہ گذشتہ اقتصادی اصولوں پر انحصار رکھتا ہے لیکن مبتدی کو خبردار رہنا چاہئیے کہ یہ سوال نہایت پیچیدہ ہے اور اسکا پورا مفہوم سمجھنے میں بڑے بڑے غلط بحث لالاشتہ سے کام لیا گیا ہے لہذا اِس خارستان میں قدم رکھنے سے پیشتر اپنا دامن سنبھال لینا چاہئیے۔ اور اِن تمام گڑھوں سے واقف ہوجانا چاہئیے۔ جنھوں نے دنیا کے بڑے بڑے تجربہ کار منطقیوں اور مصنفوں کو منہ کے بل گرادیا ہے۔ ایک محقق تحریر فرماتے ہیں کہ جو مصنف زرِ نقد کے خطرناک مضمون کو چھوتا ہے وہ ہر لحظہ معرضِ خطر میں ہے کیونکہ استدلالی اغلاط شیر اور چیتوں کی طرح اس کے گھات میں لگے رہتے ہیں۔ اس اندیشے کو مدِ نظر رکھ کر ہم اس بحث کو ایک اقتصادی اصطلاح کی تشریح سے شروع کرتے ہیں کیونکہ اس دقیق مضمون کی تفہیم کے لئے یہی راہ آسان اور محفوظ معلوم ہوتی ہے مبتدی کو لازم ہے کہ ہر جملے اور اصطلاح کے معانی کامل طور پر ذہن نشین کرتا جائے ورنہ وہ اس اہم اقتصادی بحث کی غرض وغائت اور اس کے نتائج سے پوری آگاہی حاصل نہ کر سکے گا۔

[illegible] امر قانونی طور پر فیصلہ پاتا ہے کہ زرِ نامسکوک یا سونے

چاندی کی کسی خاص مقدار کے کس قدر سکے گھڑے جائیں مثلاً انگلستان
کے موجودہ قانون (ٹکسال) کے رو سے ۴۰ پونڈ سونے کے ۱۸۶۹ سکے بنائے جاتے
ہیں جو ساورن کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ سکوں کی یہ تعداد جن میں
زر نامسکوک کی کوئی مقدار قانوناً منقسم کی جاتی ہے اس مقدار کی قیمت
ضربی کہلاتی ہے۔ اس تعریف سے ظاہر ہے کہ جب تک کوئی سکہ قانونی
لحاظ سے پورے وزن کا ہو اسکی قدر ہمیشہ اپنے ہم وزن زر نامسکوک کی
قدر کے مساوی ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ بہ عرصہ (تک) روزمرہ استعمال سے
سکوں کا وزن قانونی وزن سے کم ہو جاتا ہے۔ بالعموم خرید و فروخت میں لوگوں
کو اس امر کی پرواہ نہیں ہوتی کہ کوئی سکہ وزن کا پورا ہے یا کم ہے اسواسطے
ممکن ہے کہ بہت عرصہ تک متداول رہنے سے بعض سکوں کا وزن قانونی
وزن سے کم ہو جائے اور بیع و شرا میں ان کی قدر وہی تصور کی جائے جو
قانوناً مقرر ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ کسی سکے میں ۱۶ آنہ کی چاندی ہے اور ۱۶ آنہ
کو ہی چلتا ہے ممکن ہے کہ کثرت استعمال سے اسکا وزن کم ہو جائے
یعنی اس کی چاندی پندرہ آنہ کی رہ جائے لیکن بیع و شرا میں ۱۶ آنہ کو ہی چلتا ہے
عام خرید و فروخت میں سکوں کے وزن کی کمی کچھ اثر نہیں کرتی لیکن جب
انکا تبادلہ زر نامسکوک سے کیا جائے تو یہ اثر ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اس
صورت میں زر نامسکوک اسی قدر ملے گی جسقدر سکوں کا موجودہ وزن ہے
اگر کثرت استعمال سے ان کا وزن قانونی وزن سے کم ہو گیا ہے تو ظاہر ہے
کہ زر نامسکوک کی کوئی خاص مقدار تبادلے میں لینے کے لئے سکوں کی
زیادہ تعداد دینی پڑے گی پس متداول سکوں کی وہ تعداد جو حقیقی بازار میں ملسکے
کہ اس مقدار کی ہم وزن ہو۔ مقدار مذکور کی قیمت متعارف کہلاتی ہے

اور چونکہ کمی وزن کی صورت میں زر نامسکوک کی کسی مقدار کے عوض میں متداول سکوں کی زیادہ تعداد دینی پڑتی ہے اسواسطے ظاہر ہے کہ قیمت متعارف قیمتِ ضربی سے زیادہ ہوگی مثلاً فرض کرو کہ چاندی کی قیمت ضربی پانچ شلنگ دو پنس فی اونس ہے اور قیمتِ متعارف چھ شلنگ ہو اس کے یہ معنے ہیں کہ سکۂ متداول کے چھ شلنگ زر نامسکوک کی اس مقدار کی ہموزن ہیں جسکا ہم وزن پانچ شلنگ دو پنس کو ہونا چاہئے تھا اگر انکا وزن کثرتِ استعمال کے باعث قانونی وزن سے کم نہ ہو جاتا۔ لہذا ظاہر ہے کہ زر نامسکوک کی قیمتِ متعارف کا اس کی قیمت ضربی سے بڑھ جانا سکے کی کم قدر ہو جانے پر دلالت کرتا ہے۔ اس توضیح سے سکہ زنی کے متعلق دو ضروری اصول پیدا ہوتے ہیں :-

(ا) جب زر نامسکوک کی قیمت متعارف اس کی قیمت ضربی سے بڑھ جاتی ہے تو اس سے صرف یہی ثابت نہیں ہوتا کہ سکے کی قدر کم ہوگئی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سکۂ مذکور کی قدر کہاں تک کم ہوئی ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہو کہ (زر نامسکوک کی قیمت متعارف - زر نامسکوک کی قیمت ضربی) = اس وزن کی ہے جو سکۂ متداول کی کثرتِ استعمال سے زائل ہو گیا ہے۔

(ب) قیمت ضربی کی تعریف سے مندرجہ ذیل اصول بطور نتیجہ کے پیدا ہوتا ہے :-
زر نامسکوک کی قیمت ضربی کا بدلنا حقیقت میں سکوں کے قانونی وزن کا بدلنا ہے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ زر نامسکوک کی قیمت ضربی مختلف حالات میں مختلف ہو سکتی ہے تو یہ صریحاً غلط ہے۔ کیا اگر ایک من شراب کو جو کسی مشکی میں کبھی ہو

بہت سی بوتلوں میں ڈال دیا جائے تو شراب کی مقدار بدل جائیگی؟ ہرگز نہیں بہت سے حصوں میں منقسم ہو جانے سے اس کی مقدار میں فرق نہیں آ سکتا۔

اس تشریح کے بعد اب ہم اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ تم کو شاید معلوم ہے کہ سرکار سکہ زنی کے متعلق ایک خاص قسم کا حق رکھتی ہے جسکو حق الضرب کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس حق سے مراد زر نا مسکوک کی اس مقدار سے ہے۔ جو سرکار بطور مصارف سکہ زنی کے لیتی ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک روپے کے مصارف سکہ زنی ۲ر ہیں سرکاری ٹکسال ۲ر وضع کرنے کی خاطر روپے میں چودہ آنہ کی چاندی ڈال کر اپنے مصارف سکہ زنی نکال لے گی۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ حق الضرب دو قسم کا ہوتا ہے۔

(۱) جب کہ حق الضرب مصارف سکہ زنی کے برابر ہو۔ اس صورت میں سرکار کو کچھ فایدہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ جس قدر سرکار کا خرچ ہوتا ہے۔ اسی قدر اسے ملتا ہے۔ بعض ممالک میں حق الضرب بالکل نہیں لیا جاتا مثلاً انگلستان کی ٹکسال پونڈ میں پورے بیس شلنگ کی قیمت کا سونا ڈالتی ہے۔ بعض ممالک میں رعایا کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ حق الضرب ادا کر کے یا اس کے بغیر حسب قانون ہو سرکاری ٹکسال سے اپنے سونے یا چاندی کے ٹکڑے سکوں کی صورت میں منتقل کروا لے۔ چنانچہ انگلستان میں سونے کے سکوں کے متعلق رعایا کو یہ حق حاصل ہے کہ بغیر حق ضرب ادا کرنے کے سونے کے ٹکڑوں کو ٹکسال سے پونڈوں کی صورت میں منتقل کروا لیں۔ ۱۸۹۳ء سے پہلے ہندوستان کی رعایا کو بھی یہ حق حاصل تھا اب کسی خاص مصلحت کی وجہ سے جس کا ذکر ابھی آئے گا اس ملک کی ٹکسال رعایا کے لئے

بند ہے اور سرکار صرف اسی قدر سکے بناتی ہے جسقدر اس ملک کی ضروریات
کے لئے کافی ہو۔

(۲) جبکہ حق ضرب مصارف سکہ زنی سے زیادہ ہو۔ اس صورت میں سرکار
سکہ زنی سے فائدہ اٹھاتی ہے مثلاً ہمارے ہندوستان میں روپیہ ۱۶/
پر چلتا ہے۔ حالانکہ اس میں چاندی صرف ۱۱/ کی ہوتی ہے۔ گویا سرکار
کو فی روپیہ ۵/ فائدہ ہوتا ہے علےٰ ہذالقیاس ایک پیسے میں تین پا شاید
سات کوڑی کا نفع نہ ہوتا ہو ہم ان دونوں طریقوں پر بالترتیب بحث
کریں گے۔

اول صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کسی سکے کی قدر زر ناسکوک
کی اس مقدار کی تعداد کے مساوی ہونی چاہیے جو اس سکے میں شامل ہے یا مقدار
مذکور کی قدر میں مصارف سکہ زنی بھی شامل ہونے چاہئے۔ بالفاظ دیگر یوں کہو
کہ اگر ایک روپے کے مصارف سکہ زنی ۲/ ہوں تو کیا روپے میں ۱۴/ کی چاندی
ہو اگر اسکی قدر ۱۶/ کے برابر مقرر کرنی چاہئے یا ۱۶/ کی چاندی ڈالکر اس کی قدر
۱۸/ کے برابر ہی مقرر کرنی چاہئے۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں سرکار کو اپنے
مصارف سکہ زنی کی بابت ۲/ مل جائینگے مگر دوسری صورت میں یعنی جبکہ روپے
میں ۱۶/ کی چاندی ہے سرکار کو بطور مصارف سکہ زنی کچھ نہ ملیگا۔ یہ ایک بحث طلب
معاملہ ہے بعض حکماء کہتے ہیں کہ سرکار کو کچھ حق ضرب نہ لینا چاہئے یا یوں کہو کہ
ان کے نزدیک مصارف سکہ زنی کی خاطر اس کی حقیقی قدر سے زیادہ قدر
پر چلانا اقتصادی لحاظ سے مضرت ہے۔ مگر بعض حکماء کے نزدیک مصارف
سکہ زنی کے برابر حق ضرب کے لینے میں کوئی حرج نہیں اُن کے دلائل
مفصلہ ذیل ہیں۔

(۱) ایک قینچی کی قیمت اس کے ہموزن لوہے کی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس واسطے کوئی وجہ نہیں کہ کسی سکے کی قدر اپنے ہم وزن زر نامسکوک کی قدر سے زیادہ نہ ہو۔ سونا یا چاندی اپنی نامسکوک حالت میں اسقدر مفید نہیں ہوتے جس قدر کہ سکوں کی صورت میں ہوتے ہیں لہذا عقل اس امر کی متقضی ہے کہ جب زر نامسکوک سکوں کی صورت میں منتقل کر دیا جاوے تو اسکی قدر بھی بڑھ جائیگی جیسا کہ لوہے کی ٹکڑے کی قدر ایک زنجیر یا تلوار کی صورت میں منتقل ہو جانے سے بڑھ جاتی ہے۔

(۲) اگر کوئی حق ضرب نہ لیا جائے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ اگر سکے کی قدر اس زر نامسکوک کی قدر کے برابر ہو جو اس میں شامل ہے تو عوام کو جب زر نامسکوک کی ضرورت لاحق ہوگی سکوں کو پگھلا لیا کریں گے اور جب سکوں کی ضرورت ہوگی تو اسی زر نامسکوک کو سرکاری ٹکسال سے پھر سکوں کی صورت میں منتقل کرا لیا کریں گے یہ عمل باربار ہوتا رہے گا جس سے سرکار کو بیجا نقصان ہوگا کیونکہ سرکار کو بغیر مصارف سکہ زنی لینے کے سکے بنانے پڑیں گے۔ یہ دلیل و تھی زبردست ہے۔ مگر باوجود اس بات کے دنیا کے بعض بڑے بڑے تجارتی ملک مثلاً انگلستان وغیرہ حق ضرب نہیں لیتے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں بھی ایک فایدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جب انگلستان میں سکے کی مقدار تجارتی ضرورتوں سے زیادہ ہو جاتی ہے (تجارتی ملکوں میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے) تو اس افراط کے باعث ان کی قدر کم ہونے نہیں پاتی۔ یا یوں کہو کہ انگلستان میں اشیاء کی قیمتیں زیادہ نہیں ہونے پاتیں۔ کیونکہ سکوں کی یہ غیر ضرورتی مقدار فوراً دیگر ممالک کیطرف خود بخود منتقل ہو جاتی ہے اور دیگر ممالک کے لوگوں کو ان کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا کیونکہ عذر تو اس صورت میں ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس کی قدر اپنے ہموزن زر نامسکوک کی قدر سے زیادہ ہو دیگر ممالک کے

نزدیک جیسا زر نامسکوک ویسا انگلستان کا زر مسکوک۔ مثلاً اگر کابل کے
سکے میں ۱۰ ار کی چاندی ہو اور وہ ۱۰ ار پر ہی چلتا ہو یا یوں کہو کہ کابل حق ضرب
نہ لیتا ہو تو ہندوستان کے لوگوں کو بشرطیکہ ان کو چاندی کی ضرورت ہو اُسے
۱۰ ار پر خریدنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ غرض کہ انگلستان حق ضرب نہ لینے سے
زر نقد کی افراط کے برے نتائج سے بچ جاتا ہے۔ دوسری صورت میں
حق ضرب چونکہ مصارف سکہ زنی سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس واسطے سرکار
ٹکسال کے اجرا سے فایدہ اٹھاتی ہے۔ اکثر ممالک کے بادشاہوں نے
اس طریق عمل سے بے انتہا فایدہ اُٹھایا ہے۔ مگر پیشتر اسکے کہ ہم اس پر کوئی
رائے زنی کریں ایک نہایت ضروری اقتصادی اصول کا ذہن نشین کرنا ضروری
ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ اشیاء کی قیمت طلب و رسد کی مساوات سے متعین
ہوتی ہے۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ سونا اور چاندی جو اشیاء میں داخل ہیں اس
کلیہ قانون کے دایرہ عمل سے خارج ہوں۔ جب سونے چاندی کی مقدار
ضرورت سے بڑھ جائیگی تو ان کی قدر ضرور کم ہوگی اور جب ان کی مقدار
ضرورت سے کم ہو جائے گی تو ظاہر ہے کہ ان کی قدر زیادہ ہوگی۔ سکے جو
سونے اور چاندی سے بنائے جاتے ہیں ان کا بھی یہی حال ہے۔ کہ افراط
کی صورت میں ان کی قدر کم ہوتی ہے اور کمی کی صورت میں ان کی قدر
بڑھتی ہے فرض کرو کہ کسی ملک میں زر نقد کی مقدار اس ملک کی تجارتی
ضروریات سے بہت کم ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں زر نقد کی قدر بسبب
کمی رسد کے بڑھ جائے گی یا بالفاظ دیگر اشیاء کی قیمت کم ہو جائے گی اور
تجارتی کاروبار نہ چل سکیگا۔ لیکن اگر کسی تدبیر سے زر نقد کی موجودہ مقدار نہایت
تیزی اور سہولت کے ساتھ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو سکے

تو تجارتی کاروبار بلا روک ٹوک چلتے جائیں گے۔ اشیاء کی قیمت اصلی حالت پر عود کر آئے گی اور مزید زرِ نقد کی ضرورت لاحق نہ ہوگی۔ پس ایسے ملک کے تجارتی مقاصد آسانی کے ساتھ پورے نہیں ہو سکتے۔ جب تک اس ملک میں زرِ نقد کی مقدار زیادہ نہ ہو۔ یا کوئی صورت اعتبار کی نہ استعمال کی جائے یا اگر ایسا نہ ہو سکتا ہو تو کسی طرح مقدار موجود میں سرعتِ انتقال نہ پیدا ہو کیونکہ سرعتِ انتقال بھی ایک طرح کی ازدیادی زرِ نقد ہے جو سکہ پہلے ایک دفعہ استعمال ہوتا تھا ممکن ہے کہ سرعتِ انتقال کی صورت میں دس دفعہ استعمال ہو۔ یا یوں کہو کہ اس طریق سے ایک سکہ وہی کام کر سکتا ہے جو ازدیادی زرِ نقد کی صورت میں دس سکوں کی وساطت سے پورا ہوتا۔

گویا زرِ نقد کی سرعتِ انتقال کا زیادہ ہونا ایک طرح سے زرِ نقد کی مقدار کا زیادہ ہونا یا بالفاظ دیگر زرِ نقد کی قدر کا کم ہونا ہے۔ اور اشیاء کی قیمت کا بڑھنا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس زرِ نقد کی قدر کی زیادتی اس کی مقدار اور سرعتِ انتقال اور قیمت اشیاء کی کمی پر دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا جب کسی ملک میں زرِ نقد کی مقدار تجارتی ضروریات سے کم ہو۔ تو اس کا علاج یہی ہو سکتا ہے کہ مقدار کو زیادہ کیا جاوے یا کسی تدبیر سے زرِ نقد کی سرعتِ انتقال زیادہ ہو جاوے۔ لیکن جب کسی ملک میں زرِ نقد کی مقدار تجارتی ضروریات سے بہت بڑھ جاوے یا یوں کہو کہ اشیاء کی قیمتیں بڑھ جائیں تو اسکا کیا علاج؟ اسکا سیدھا جواب یہ ہے کہ زرِ نقد کی رسد کو محدود کر دیا جائے۔ ۱۸۹۴ء سے پہلے ہمارے ملک میں نئی کانوں کے دریافت ہونے اور ٹکسال کے عام طور پر کھلا ہونے سے روپے کی قدر بہت کم ہو کر ۱۲ پنس کے برابر رہ گئی تھی جس سے ملک میں اشیاء کی قیمتیں بڑھ گئیں اور سرکار کی مالگذاری

کو نقصان ہونے لگا کیونکہ جو روپیہ ہمیں انگلستان کی پنشنوں تنخواہوں اور
دیگر مصارف حکومت کی بابت دینا پڑتا ہے وہ مالگذاری میں سے ہی
ادا کیا جاتا ہے ایک پونڈ کے لئے جہاں پہلے دس روپیہ دینے پڑتے تھے
چاندی کی قدر کم ہو جانے کی وجہ سے ۱۶ روپیہ دینے پڑے کیونکہ ہمکو یہ روپیہ
سونے کے سکے میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا علاج سرکار ہند نے یہ کیا کہ زر
نقد کی رسد محدود کر دی یعنی ٹکسالیں بند کر دیں۔ آجکل رعایا کو یہ حق حاصل نہیں
کہ چاندی کے ٹکڑے دیکر سرکاری ٹکسال سے روپیہ بنوا لے بلکہ سرکار ملک
کی تجارتی ضرورتوں کو مدنظر رکھکر خود روپیہ بناتی ہے۔ اس تجویز کی اگرچہ
اس وقت مخالفت کی گئی تھی۔ لیکن اس کی عمدگی اس کے اثر سے ظاہر ہے
یعنی ہمارا روپیہ اب ۱۳ پنس کی جگہ ۱۶ پنس کے برابر ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ
ہے کہ جو شئے معیار قدر مقرر کی جائے۔ اس کی قدر کا متغیر ہو جانا تمام تجارتی
انتظام کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

غرض کہ مندرجہ بالا توضیح سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ زر نقد کی قدر اس کی
رسد کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔ رسد زیادہ ہو گی تو اس کی قدر کم ہو گی۔ اور اگر
رسد کم ہو گی تو اس کی قدر بڑھے گی پس صاف ظاہر ہے کہ اگر سرکار مصارف
سکہ زنی سے زیادہ حق ضرب وصول کرے تو زر نقد کی قوت خرید یعنی قدر پر
اس کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کسی ملک کی سرکار خواہ کتنا ہی حق ضرب
کیوں نہ لے زر نقد کی قوت خرید وہی رہے گی۔ کیونکہ یہ تو صرف تبادلہ کا
ایک ذریعہ ہے جب تک اس کی مقدار کسی ملک کی تجارتی ضرورتوں کے
مطابق ہو گی۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس کی قدر میں کوئی تغیر آئے۔ لہذا نتیجہ
ظاہر ہے کہ زر نقد کی قدر کی کمی بیشی اس کی رسد کی کمی بیشی پر موقوف ہے

حق ضرب کی کمی بیشی کو زر نقد کی قدر کی کمی بیشی کے ساتھ کوئی ضروری تعلق نہیں۔ اگر روپے میں ۱۱ ر کی جگہ ۸ ر کی چاندی ڈالی جائے۔ یا یوں کہو کہ سرکار ہند ۵ ر کی جگہ ۸ ر حق ضرب لیوے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس سے روپے کی قدر میں کمی پیدا ہو روپیہ بحیثیت ایک وسیلہ تبادلہ ہونے کے بدستور ۱۶ ار پر چلتا رہے گا۔

پس اس باب کی ساری بحث کو مختصر الفاظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ زر نقد کی قدر کی کمی کے دو ضروری اسباب ہیں جنکو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے۔

۔ اول زر نامسکوک کی قیمت متعارف کا اس کی قیمت ضربی سے زیادہ ہونا جیسا کہ ابتدا میں لکھا جا چکا ہے۔

دوئم اس کی رسد کا تجارتی ضرورتوں سے زیادہ ہونا۔

تم کہو گے کہ اگر حق ضرب کا زیادہ ہونا اس کی قدر پر کچھ اثر نہیں رکھتا تو پھر ایسے سکوں کے جاری کرنے میں کیا ہرج ہے۔ جنکی قدر ان کی قدر حقیقی سے زیادہ ہو بیشک سرکار خواہ کتنا ہی حق ضرب کیوں نہ لے۔ کوئی نقصان نہیں صرف یہ بات ہے کہ اگر ایسا سکہ کثرت سے جاری کیا جاوے تو تجارت بیرونی پر بُرا اثر ہوتا ہے کیونکہ دیگر ممالک میں ایسے سکوں کی قدر زر نامسکوک اس مقدار کے لحاظ سے متعین ہوگی جو ان میں شامل ہے۔

باب پنجم

زرِ کاغذی

باب گذشتہ میں بیان ہو چکا ہے کہ سرکار جسقدر چاہے حق ضرب لے سکتی ہے۔ ہندوستان میں ہماری سرکار فی الحال فی روپیہ ۵ر حق ضرب لیتی ہے لیکن اقتصادی اصول کے رو سے اگر ۱۵ر فی روپیہ بھی حق ضرب لیا جائے تو ملک کی خرید و فروخت کو کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ روپیہ فی الحقیقت تبادلۂ اشیاء کا ایک ذریعہ ہے جس کی قدر دیگر اشیاء کی طرح رسد اور طلب کی درمیانی مساوات سے متعین ہوتی ہے مختلف ممالک میں حق ضرب کی مقدار مختلف ہوتی ہے بعض جگہ پانچ فیصدی بعض جگہ دس فیصدی۔ لیکن کیا یہ کی کوئی ایسی صورت بھی ہو سکتی ہے جس میں سرکار کے حق ضرب کی مقدار پوری سو فیصدی ہو بے شک زرِ کاغذی کے اجرا کی صورت میں سکوں کی وہ تمام مقدار بچ جاتی ہے۔ جو زر مذکور کے عدم اجرا کی صورت میں سرکار کو جاری کرنی پڑتی۔ اگر سرکاری اوراق جو ہمارے ملک میں متداول ہیں جاری نہ کئے جاتے تو ظاہر ہے کہ سرکار کو ان کی جگہ سکہ مذکور متداول کرنا پڑتا۔ لیکن اس زر کاغذی کی وساطت سے ہماری سرکار اس اجرا سے سبکدوش ہو گئی ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ سکے کی اس خاص صورت میں ہماری سرکار نے پورے سو فیصدی حق ضرب لیا ہے۔ زرِ کاغذی کے پہلے موجد

چین کے لوگ ہیں۔ بارھویں صدی میں جبکہ مشہور سیاح مارکوپولو نے ملک چین کا سفر کیا تو اس سے معلوم ہوا کہ وہاں ایک درخت کی چھال کا سکہ جاری ہے جو لین دین میں سونے چاندی کے سکوں کی طرح استعمال ہوتا ہے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں فارس اور جاپان کے حکمرانوں نے بھی چین کی تقلید کی لیکن یورپ کی اقوام نے اس کے استعمال کے فوائد صدیوں بعد محسوس کئے۔

زرِ کاغذی کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) زرِ کاغذی غیر متبدل جو عند الطلب زرِ نقد کی صورت میں تبدیل نہیں کرایا جاسکتا۔

(۲) زرِ کاغذی متبدل یا زرِ بنک جو عند الطلب زرِ نقد کی صورت میں تبدیل کرایا جاسکتا ہے مقدم الذکر کی صورت میں یا تو خود اسے سرکار جاری کرتی ہے یا بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی تجارتی یا دیگر حادثے کے باعث کسی ملک میں زرِ نقد کی مقدار کم ہوگئی تو سرکار ملکی زرِ بنک کو زرِ غیر متبدل کی صورت میں منتقل کر دیتی ہے۔ ایسی حالت میں زرِ بنک کو عند الطلب زرِ نقد کی صورت میں تبدیل نہیں کرا سکتے کیونکہ سرکار کے خزانے میں زرِ نقد ہوتا ہی نہیں ہے جو اس کے عوض میں دیا جائے ۱۷۹۷ء اور ۱۸۲۱ء کے درمیان انگلستان میں اور ۱۸۴۸ء میں فرانس میں یہی حالت رہی کہ سرکاری بنکوں کے اوراق عند الطلب زرِ نقد کی صورت میں تبدیل نہیں کرائے جاسکتے تھے۔ چونکہ زرِ کاغذی غیر متبدل میں اپنے آپ کو ملک کی حالات اقتصادی کے تغیر کے ساتھ مطابق کرنے کی قابلیت نہیں ہے اس واسطے اسکا اجرا کچھ بہت مفید نہیں ہے۔

بعض حکما کے نزدیک زرِ کاغذی زر نہیں کہلا سکتا کیونکہ ان کی رائے میں زرِ نقد کی یہ خاص صورت بحیثیت وسیلہ تبادلہ ... قومی اور تجارتی

بہبودی کیلئے مضرت رساں ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ دلیل منطقی لحاظ سے بالکل ناقص ہے
اسی طرح کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں شراب کے استعمال کو بحیثیت اس کے
کہ یہ پینے کی چیز ہے برا سمجھتا ہوں لہذا شراب پینے کی چیز نہیں ہے حقیقت یہ ہے
کہ جو شے زرِ نقد کے مقاصد کو انجام دیتی ہے وہ زرِ نقد ہے خواہ کاغذ ہو خواہ
پتھر۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ زرِ کاغذی زرِ نقد کی طرح وسیلۂ تبادلہ کی حیثیت
سے استعمال ہو سکتا ہے اور حقیقتاً اس حیثیت سے مختلف ممالک میں
استعمال ہوا ہے اور ہوتا ہے جوں جوں کسی ملک میں پیدائش دولت اور
تجارت کی مختلف صورتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں توں توں ضرورت مجبور کرتی
ہے کہ زرِ نقد کے مقاصد کو سرانجام دینے کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوں ایسے
حالات میں جو شے خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ان مقاصد کو پورا کریگی زرِ نقد یا
زرِ نقد کے قائم مقام ہوگی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ زرِ کاغذی ہمیشہ اور ہر ملک
میں زرِ نقد ہے بلکہ ہمارا مدعا یہ ہے کہ جب کسی جگہ سکے کی یہ صورت زرِ
نقد کے مقاصد کو پورا کرنا شروع کرتی ہے اس وقت سے زرِ نقد بن جاتی ہے
اور جب تک ان مقاصد کو پورا کرتی رہتی ہے زرِ نقد ہی بنی رہتی ہے اور اگر کسی
ملک کی سرکار دیوالیہ ہو جائے اور اپنے جاری کردہ اوراق کو قانوناً زرِ کاغذی
غیر متبدل کی صورت میں منتقل نہ کرے تو ظاہر ہے کہ سرکاری اوراق کو خرید و
فروخت میں کوئی شخص قبول نہ کرے گا یا یوں کہو کہ سرکاری اوراق زرِ نقد
نہ رہینگے۔ اسی بنا پر زرِ کاغذی بطور معیارِ قدر بھی مستعمل ہو سکتا ہے کیونکہ
جو شے وسیلۂ تبادلہ ہوگی ضرور ہے کہ معیارِ قدر بھی ہو۔ علیٰ ہذا القیاس
زرِ کاغذی ادائگی غیر معجل کا معیار بھی ہو سکتا ہے کیونکہ بالعموم یہ نقد قانونی ہوتا ہے
یعنی قرضخواہ قانوناً اس کے قبول کرنے پر مجبور کئے جا سکتے ہیں بلکہ اگر یہ نقد قانونی

نہ بھی ہو تو بھی یہ روزمرہ کے استعمال میں غالباً اونکی غیر مجل کا معیار قرار پائے جائیں گے۔ کیونکہ ہر شخص اشیاء کی قیمتوں کو زرِ نقد متداول سے تعبیر کرنیکا ایک زبردست میلان رکھتا ہے۔ لہذا زرِ نقد کی طرح زرِ کاغذی کی قدر بھی اس کی طلب و رسد پر انحصار رکھتی ہے اور جس طرح ہم پہلے ثابت کر آئے ہیں کہ حق ضرب اور زرِ نقد کی قدر کی کمی بیشی کے درمیان کوئی ضروری تعلق نہیں ہے اسی طرح سے یہ بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ زرِ کاغذی کے غیر متبدل ہونے اور اس کی کمی بیشی کے درمیان کوئی ضروری رشتہ نہیں۔ اس کی قدر صرف ایسی صورت میں کم ہو سکتی ہے جب اس کی مقدار ان سکوں کی قیمت جنرلی سے زیادہ ہو جو اس کی عدم اجراء کی صورت متداول کرنے پڑتے۔ اس کی ارزانی اس کے اجراء کی محرک ہوتی ہے اور اس کے اجراء کی ضرورت اسوقت پڑتی ہے جبکہ سرکار کو فائدہ اٹھانا مطلوب ہو یا کسی قومی حادثے کے باعث زرِ نقد کی مقدار کم ہو گئی ہو غرض کہ زرِ کاغذی زرِ نقد کے تمام مقاصد کو پورا کر سکتا ہے لہذا کوئی وجہ نہیں کہ یہ زرِ نقد نہ ہو سکے بشرطیکہ اسکی مقدار متداول زائد از ضروریاتِ ملکی نہ ہو۔ اگر اس کی مقدار زائد از ضرورت ہو گی تو اس کی قدر کم ہو جائیگی۔ اور قرضخواہوں کو نقصان ہوگا۔ مقروض فائدے میں رہینگے کیونکہ اس کی قوتِ خرید بسبب کمی قدر کے دن بدن کم ہوتی جائیگی اور چونکہ یہ ایک ملک کی دوسرے ممالک میں منتقل نہیں ہو سکیگا۔ (کیونکہ دیگر ممالک کے لوگ کم قدر سکے کو قبول نہیں کرینگے بلکہ پوری قدر قائم رہنے کی صورت میں بھی اس کا قبول کرنا نہ کرنا ان کے اختیار میں ہے) اس واسطے اس ملک کی تجارتِ خارجی کو انتہا درجے کا نقصان پہنچیگا۔ جہاں زرِ کاغذی کی قدر کم ہو گئی ہے۔

زرِ بنک[1] اس زرِ کاغذی کا نام ہے جو عند الطلب زرِ نقد کی صورت میں تبدیل کرایا جاسکتا ہو۔ سرکار یا خود اپنی بنک جاری کرتی ہے یا چند اشخاص جمع ہو کر سرکار کی منظوری سے بطورِ خود بنک جاری کر سکتے ہیں۔ لیکن دونوں صورتوں میں بنک کا چلنا بنک والوں کے اعتبار یا ساکھ پر منحصر ہے۔ اگر انکی ساکھ نہ ہوگی تو نہ کوئی شخص ان کے جاری کردہ اوراق کو قبول کریگا۔ اور نہ انکی تعویض میں اپنا روپیہ دیگا۔ چونکہ زرِ کاغذی کے تداول کی بنا ساکھ پر ہے۔ اس واسطے ظاہر ہے کہ ہر بنک کے پاس زرِ نقد کی ایک کافی مقدار موجود ہونی چاہیئے تاکہ جس وقت کوئی شخص کسی بنک کے اوراق کو بنک مذکور سے زرِ نقد کی صورت میں تبدیل کرانا چاہے فوراً کرا سکے اگر ایسا نہ ہوگا تو بنک کی ساکھ جاتی رہیگی۔ لہذا ہر بنک اس خوف کو مدِ نظر رکھ کر زرِ مسکوک کی ایک خاص مقدار اپنے پاس رکھتا ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ جس قدر زرِ نقد کسی بنک کے پاس موجود ہے اس سے بہت زیادہ کے اوراق جاری کئے جائیں ورنہ بنک کو کچھ فائدہ نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ یہ بات ساکھ یا اعتبار کے بل پر ہی ہو سکتی ہے بصورتِ دیگر ممکن نہیں۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بنک والے کم شرح سود کے عوض ایک سے روپیہ مستعار لیتے ہیں اور دوسرے کو ایک زیادہ شرح سود کے عوض مستعار دیکر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنک کبھی روپیہ قرض نہیں دیتا۔ بلکہ ساکھ کے بل پر اپنی موجودہ زرِ نقد کی مقدار سے زیادہ کے اوراق جاری کرکے یا اعتبار کی اور صورتیں پیدا کرکے فائدہ اٹھاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر

[1] لفظ بنک عام طور پر حال کی عربی زبان میں مستعمل ہوتا ہے اسکی جمع بنوک آتی ہے لہذا ترکیب اضافی میں اسکا استعمال خلافِ قواعدِ اردو نہیں ہے۔

یوں کہو کہ بنک ایک قسم کی دکان ہے جہاں اعتبار بکتا ہے لوگ اپنا روپیہ تجارتی ہنڈیاں اور حقوق کی دیگر صورتیں لاتے ہیں اور بنک ان کے عوض میں گویا اپنے اعتبار کی ایک مساوی مقدار دیتا ہے یا یوں کہو کہ وہ اپنے گاہکوں کو یہ حق دیتا ہے کہ جب چاہیں جہاں چاہیں اپنا روپیہ وصول کرلیں۔ یا یہ حق وصولی کسی اور کو تفویض کردیویں اور بصورتِ عدم ادائگی اس پر نالش کرکے وصول کرلیں۔

چونکہ وہ حقوق جو بنک اپنے گاہکوں کو دیتا ہے غیر مادی ہونے کی وجہ سے قابلیتِ انتقال نہیں رکھتے۔ اس واسطے ضرور ہے کہ اس غرض کے لئے ان کو کاغذ پر تحریر کیا جائے۔ لہذا بنک یا تو اپنے اوراق جاری کرتا ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ گاہک کو یا ورقہ بنک کے قابض کو کوئی خاص رقم عند الطلب ادا کردی جائیگی یا گاہک بنک کو اپنا دستی رقعہ لکھ سکتا ہے کہ کوئی خاص رقم عند الطلب فلاں شخص کو ادا کردی جائے۔ اس قسم کے رقعہ کو چک کہتے ہیں لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ جو روپیہ بنک اپنے اعتبار کے عوض میں اوروں سے وصول کرتا ہے وہ امانت نہیں ہے بلکہ بنک کی ملکیت ہے جسکو بنک تجارتی اغراض میں لگاکر فائدہ اٹھاتا ہے اس روپیہ کے بل پر وہ اعتبار کے عوض دیگر حقوق خرید کرتا ہے اور اس کے اعتبار کی مقدار جس کے عوض میں وہ دیگر حقوق خرید کرتا ہے روپیہ کی اس مقدار سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ جو اس کے پاس موجود ہوتی ہے اعتبار کی اس قدر توسیع ہی اس کے فائدہ کی بنیاد ہے لہذا جو شخص یہ کہتا ہے کہ میرا اس قدر روپیہ بنک میں موجود ہے وہ اگرچہ محاورۂ متعارفہ کی رو سے صحیح الفاظ استعمال کرتا ہے تاہم اصولِ بنک کے لحاظ سے یہ استعمال صحیح نہیں ہے۔

کیونکہ بنک میں جس قدر روپیہ ہے وہ بنک کی ملکیت ہے نہ ان اشخاص کی جن سے وہ روپیہ لیا گیا ہے البتہ یہ اشخاص ایک مجرد حق کے مالک ہیں یعنی ان کو یہ حق حاصل ہے کہ جب چاہیں جہاں چاہیں اپنا روپیہ وصول کرلیویں پس ظاہر ہے کہ بنک کا سرمایہ اس کا اعتبار ہے وہ اس اعتبار کی وساطت سے روپیہ تجارتی قرضے حقوقِ نالش اور دیگر اقسام کے مجرد حقوق بعینہٖ اسی طرح خرید کرتا ہے جس طرح کوئی شے روپے کی وساطت سے خریدی جاوے اور اپنے اعتبار کی قیمت بھی اسی طرح وصول کرتا ہے جیسے یہ حقیقت میں زرِ نقد ہو جس طرح سوداگر اپنی اشیاء کو کم قیمت پر خریدتا ہے اور زیادہ قیمت پر بیچکر فائدہ اٹھاتا ہے اسی طرح بنک بھی اپنی اشیاء یعنی اعتبارات قرضے اور حقوقِ نالشی وغیرہ کو ایک شخص یعنی اپنے گاہک سے خرید کرتا ہے اور ان کو زیادہ قیمت پر اور شخص یعنی مقروض کے پاس فروخت کرتا ہے کیونکہ جس قرضہ کو بنک خریدتا ہے اس کی قیمت دن بدن بڑھ رہی ہے اور بڑھتی رہے گی جب تک کہ وہ ادا نہ ہو جائے۔ چونکہ اس خرید و فروخت سے جس کی بنا اس کے ذاتی اعتبار پر ہے بنک کو منافع ہوتا ہے لہذا بنک کا ذاتی اعتبار اسکا سرمایہ ہے جو بنک کی موجودہ زرِ نقد کی مقدار سے زیادہ ہونے کے باعث ملک کے سرمائی کو بہت زیادہ کر دیتا ہے۔

بعض محققین کی یہ رائے ہے کہ اگر زرِ بنک کو زرِ نقد کی صورت میں تبدیل کرانے میں ہر طرح کی آسانی ہو۔ تو ہر حالت میں ایسا ہی ہوگا جیسا سونے چاندی کے سکے جنکو یہ تعبیر کرتا ہے گویا زرِ نقد کی ان دونوں صورتوں کے درمیان کوئی فرق نہ ہوگا۔ مگر اس غرض کے لئے کہ زرِ بنک ہر حالت میں [illegible] سونے یا چاندی کے سکے جنکو یہ تعبیر کرتا ہے ضروری ہے

کہ بنکوں کا انتظام نہایت صحیح اصول کے مطابق ہو اس رائے کو علم اقتصاد کی اصطلاح میں اصولِ بنک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بعض حکما اس رائے کے مخالف ہیں ان کا یہ خیال ہے کہ اگر ملک کے تمام بنکوں کو یہ خیال ہو۔ کہ اپنے اپنے سود و زیان کو ملحوظ رکھکر جس قدر چاہیں اوراق جاری کریں تو ضروریاتِ ملکی سے زیادہ اوراق جاری ہوجانے کا اندیشہ ہوگا۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ بنکوں کے اجراے اوراق پر قانونی قیود ہوں یہ اصول جس کو علم الاقتصاد کی اصطلاح میں اصول تداول سے موسوم کرتے ہیں۔ اول ملک چین میں وضع کیا گیا تھا۔ اسی اصول پر انگلستان میں ۱۸۴۴ء میں بنک ایکٹ پاس ہوا جس کے شرائط مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) بنک انگلستان کو ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ سے زیادہ کے نوٹ جاری کرنے کا اختیار نہ ہوگا رقم مذکور سے زیادہ کے اوراق جاری کرنے کے لئے اس کے پاس زرِ مسکوک کی مقدار موجود ہونی چاہئے۔

(۲) بنکِ مذکور کا محکمہ اجراے اوراق اور محکمہ بنک الگ الگ ہونگے۔

(۳) لنڈن کا کوئی اور بنک یا کوئی ایسا بنک جس کی میعاد ۱۸۴۴ء سے شروع ہوتی ہے اوراق نہیں جاری کرسکیگا ۱۸۴۴ء سے پہلے کے بنک اپنی اوراق کی تعداد اس تعداد سے زیادہ نہیں کرسکینگے جو سن مذکور میں تھی۔

مذکورہ بالا ہر دو راؤں کے مؤیدوں کے درمیان ایک طول طویل بحث بڑی سرگرمی کے ساتھ جاری ہے اور چونکہ جانبین کے دلائل ہر رائے میں ہم وزن معلوم ہوتے ہیں۔ اس واسطے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے

کہ دونوں میں کون سی راے قابلِ ترجیح ہے :-

باب ششم

اعتبار کی ماہیت و مقاصد اور اسکا اثر اشیاء کی قیمتوں پر

جب کوئی شخص یہ حق رکھتا ہے کہ کسی دوسرے شخص سے عند الطلب یا ایک مقررہ میعاد کے بعد کوئی رقم وصول کرے یا اُس سے کوئی خدمت لیوے تو اس حق کو حق اعتبار کہتے ہیں۔ مثلاً فرض کرو کہ میں کسی سوداگر سے کوئی شے اس معاہدے پر خریدتا ہوں کہ کسی خاص میعاد کے بعد اس شے کے عوض میں اُس کی رقم ادا کر دونگا۔ ظاہر ہے کہ گویا یہ چیز میں نے اپنے اعتبار کی وساطت سے خریدی ہے اور اس کے عوض سوداگر مذکور کو یہ حق دیا ہے کہ اگر میں مقررہ میعاد کے بعد رقم مذکور ادا نہ کروں تو اسے اختیار ہے کہ قانونی چارہ جوئی کر کے وہ رقم وصول کرلے۔ علیٰ ہذا القیاس اگر میں کسی ڈاکخانے سے کوئی ٹکٹ والا لفافہ خرید کروں تو اس کے یہ معنے ہیں کہ مجھے ڈاکخانے پر اعتبار ہے کہ میرا خط فلاں مقام پر پہنچ جائیگا۔ اگر مجھے یہ اعتبار نہ ہوتا تو میں اس لفافے کو ہرگز نہ خریدتا۔ گویا میں نے اپنے پیسوں کے عوض ڈاکخانے کا اعتبار خرید کیا ہے اور ڈاکخانے نے اپنے اعتبار کے عوض میرے پیسے خرید کئے ہیں۔

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ زمانہ حال کے مہذب ممالک میں اعتبار او

دیگر حقوق بھی بطور سرمایہ مستعمل ہو کر ملک کے سرمائے کو بہت زیادہ کرتے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو بڑے بڑے رفاہ عام کے کام مثلاً ریلوے اور آبرسانی وغیرہ سرانجام پذیر نہ ہو سکتے۔ کیونکہ ایسے کاموں کے لئے کثیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے جو بالعموم فرد واحد مہیا نہیں کر سکتا۔ بلکہ چند آدمی ملکر اپنے اعتبار پر اوروں سے روپیہ حاصل کرتے ہیں اور اس مجموعی کوشش سے بڑے بڑے عظیم الشان اور منفعت خیز کام کر کے مزید دولت پیدا کرتے ہیں۔

بعض حکما اس بات پر مصر ہیں۔ کہ کسی شخص کا ذاتی اعتبار اس شخص کی دولت میں داخل نہیں۔ لیکن یہ رائے سراسر غلط ہے۔ ہر شے جو قوت خرید رکھتی ہے دولت ہے اور چونکہ اعتبار کی وساطت سے بھی اشیاء اسی طرح خریدی جا سکتی ہیں جس طرح نقد روپے کی وساطت سے یعنی اعتبار بھی قوت خرید رکھتا ہے اس واسطے صریح نتیجہ یہ ہے کہ اعتبار دولت ہے یہ ایک ایسا قیاس ہے جس سے کسی کو گریز نہیں ہو سکتی۔

اعتبار کی غرض وغایت یا مقصد تجارت کے دائرہ کو وسیع کرتا ہے مثلاً فرض کرو کہ میں ایک کتاب کا حق تصنیف خرید کرتا ہوں ظاہر ہے کہ جو روپیہ میں نے حق مذکور کے عوض میں دیا ہے وہ اس توقع پر دیا ہے کہ مجھے اس حق کے قبضے کے آئندہ منافع ہوگا اگر یہ توقع نہ ہوتی تو میں یہ حق ہرگز نہ خرید کرتا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ جو روپیہ میں نے دیا ہے وہ ان منافع کی قیمت نقد ہے جو مجھے اس حق کے قبضہ سے آئندہ حاصل کرنے کی توقع ہے پس اس توقع یا اعتبار کی بدولت ان منافع کی قیمت نقد بھی تجارت یا خرید و فروخت کے دائرہ میں آگئی جو ابھی حاصل ہونا ہے علیٰ ہذا القیاس جب میں کسی کمپنی کے حصص خریدتا ہوں تو میری غرض یہی ہوتی ہے کہ مجھے منافع ہو۔ اگر مجھے کمپنی مذکور کے حصص کی خرید سے آئندہ منافع

کی توقع نہو۔ یا یوں کہو کہ کمپنی مذکور پر اعتبار نہ ہو تو میں کبھی ان حصص کا خریدار نہ ہونگا۔ پس کمپنی کے اعتبار کی وساطت سے حصص کے آئندہ منافع کی قیمتِ نقد (یعنی جو روپیہ میں نے حصص کے عوض اب ادا کر دیا ہے) بھی تجارت کے دائرہ میں آگئی۔ لہٰذا اعتبار کا مقصد منافع مستقبلہ کی قیمتِ نقد کو تجارت کے دائرہ میں لانا ہے۔ کسی فرانسیسی مصنف نے کیا خوب کہا ہے۔

کہ انسان مکان کو تجارت کے ذریعہ اور زمان کو اعتبار کے ذریعہ فتح کرتا ہے۔

چونکہ اعتبار اور اس کی مختلف صورتیں یعنی تجارتی ہنڈیاں چک اور اوراق بنک وغیرہ زرِ نقد کے قائم مقام ہیں۔ اس واسطے تھوک فروشی کی صورت میں ان کا استعمال بالخصوص مفید ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی ہنڈی کئی سوداگروں کے ہاتھوں میں پھر جاتی ہے۔ اور ان کی تجارتی ضروریات کو اس طرح رفع کرتی ہے جس طرح زرِ نقد۔ مثلاً فرض کرو کہ ب نے ا سے ہزار روپیہ کی ہنڈی لی ہے۔ ب اس ہنڈی کی پشت پر دستخط کرکے ج سے ہزار روپیہ کی اشیاء خرید کر سکتا ہے۔ اور اسی طرح ج اس کی پشت پر دستخط کرکے د سے اشیاء خرید کر سکتا ہے اور یہ عمل متواتر کئی بار ہو سکتا ہے۔ اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ ہنڈی مذکور میں زرِ نقد کی سی قوتِ خرید ہے اور اُس کا اثر خرید و فروخت پر ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ زرِ نقد کا۔ پس جب تک یہ ہنڈی متداول رہیگی ہزار روپے کے قائم مقام تصور کی جائیگی کیونکہ اگر ہنڈیاں اور اعتبار کی دیگر صورتیں استعمال میں نہ آئیں تو صاف ظاہر ہے کہ خرید و فروخت میں زرِ نقد کی ضرورت پڑتی۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اشیاء کی قیمتیں زرِ نقد متداول کی مقدار پر منحصر ہیں۔ اشیاء تجارت کی تعداد ... ہے اور زرِ نقد

کی مقدار بڑھ جاوے تو ظاہر ہے کہ اشیاء کی قیمتیں بڑھ جائینگی۔ علیٰ ہذا القیاس اگر اشیائے تجارت کی تعداد بڑھ جاوے اور زرِ نقد متداول کی مقدار بدستور ہی رہے اور اس میں کوئی مزید سرعتِ انتقال پیدا نہ ہو تو اشیاء کی قیمتیں کم ہو جائینگی کیونکہ زرِ نقد کی مقدار کی کمی کے باعث اس کی قدر زیادہ ہو جائیگی جس کے یہ معنے ہیں کہ اس کے عوض بہت سی اشیاء مل سکینگی۔ جُوں جُوں کسی ملک میں اشیاءِ تجارت کی تعداد بڑھتی جاتی ہے یا یوں کہو کہ خرید فروخت کے نئے نئے موقعے نکلتے آتے ہیں تُوں تُوں زرِ نقد متداول کی مقدار بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوتی جاتی ہے۔ جن ممالک میں انسانی جان و مال ہر طرح سے محفوظ ہیں وہاں اس ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر اعتبار کی مختلف صورتیں استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ کیونکہ ان سے بھی وہی کام نکلتا ہے جو زرِ نقد کے استعمال سے۔ اگر تجارتی ہنڈیاں یا اعتبار کی دیگر صورتیں دائرۂ تجارت میں نہ آئیں تو زرِ نقد متداول کی مقدار کو بڑھانے کی ضرورت پڑتی اور اشیاء کی قیمتیں بسبب زرِ نقد کی قدر کے زیادہ ہو جانے کے کم ہو جاتیں پس ظاہر ہے کہ خرید و فروخت جو اب ہنڈیوں یا دیگر اعتبار کی صورتوں کی وساطت سے ہوتی ہے زرِ نقد کی وساطت سے ہوتی۔ تو دو نتیجوں میں سے ایک نتیجہ ضرور پیدا ہوتا یا زرِ نقد کی زیادہ مقدار متداول کرنی پڑتی یا اشیاء کی قیمتیں کم ہو جاتیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ہنڈیوں کا اثر جو اشیاء کی قیمتوں پر پڑتا ہے اسکا باعث یہ نہیں کہ ہنڈی میں کوئی خاص قسم کی خصوصیت ہے ہنڈی یا اعتبار کی اور صورت بذاتِ خود کوئی اثر اشیاء کی قیمتوں پر نہیں ڈال سکتی بلکہ یہ اثر اس اعتبار کا نتیجہ ہے جسکا کہ ہنڈی مذکور محض ایک تحریری ثبوت یا شہادت ہے۔ سوداگروں کی بہیوں میں جو خریداروں کے حساب درج

ہوتا ہے وہ بھی اشیاء کی قیمتوں پر ویسا ہی اثر ڈال سکتا ہے کیونکہ یہ بھی اعتبار ہی کی ایک شکل ہے۔ ہاں اس قدر فرق ضرور ہے کہ ہنڈی کی طرح یہی کاغذ دست بدست منتقل نہیں ہو سکتا۔ اسواسطے اس میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ اسی کی وساطت سے تجارتی اشیاء خرید کی جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشیاء کی قیمتوں پر حساب مذکور کا اثر محدود ہوتا ہے۔

اعتبار کا ایک اور اثر یہ ہے کہ اس کا استعمال کسی خاص فرد یا ملک کی قوت خرید کو بہت زیادہ کر دیتا ہے اگر خرید و فروخت میں اعتبار سے کام نہ لیا جاتا تو اشیاء کی طلب موجودہ صورت سے بہت کم ہوتی یہ سب اسی کا ظہور ہے کہ بعض دفعہ کسی شے کی مانگ غیر محدود طور پر بڑھ جاتی ہے۔ سنہ ۱۸۲۹ء میں جب ہماری سرکار کا ملک چین سے تنازعہ ہوا تو اکثر لوگوں کا یہ خیال تھا کہ چاء کی رسد کم ہو جائیگی اور اس واسطے اس کی قیمت بہت بڑھ جائیگی لہذا اکثر دکان دار اس اثر کے خواہش مند تھے کہ شے مذکورہ کا ذخیرہ جمع کر لیں اور ضرورت کے موقع پر فائدہ اٹھائیں۔ ایک دکاندار کے پاس صرف ۱۲۰۰ پونڈ کا سرمایہ تھا جو اس کے تجارتی کاروبار میں لگا ہوا تھا لیکن اس نے یہ تدبیر کی کہ جن سوداگروں کے ساتھ اس کی مدت سے ساکھ چلی آتی تھی ان سے اپنے نام کی ۳ ماہی ہنڈیاں دیکر چاء کی ایک کثیر مقدار خرید کر لی۔ ہنڈیوں کی میعاد ختم ہونے سے پیشتر ہی چاء کی قیمت بہت بڑھ گئی اور دکاندار مذکور نے بے انتہا فائدہ اٹھایا۔ اگر اعتبار نہ ہوتا تو دکاندار مذکور میں یہ قوت خرید نہ ہوتی جو اس کے لئے اسقدر سودمند ثابت ہوئی۔

حصۂ چہارم

بابِ اوّل

پیداوارِ دولت کے حصہ دار۔ لگان

تمدنِ انسانی کی ابتدائی صدیوں میں حقِ ملکیت یا جائدادِ شخصی کا وجود مطلق نہ تھا۔ محنت کی پیداوار میں حسبِ ضرورت ہر شخص کا حصہ تھا ہر شے ہر شخص کی گویا ملکیت تھی اور کوئی خاص فرد یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ خاص شے میری ملکیت ہے اور یہ کسی اور کی۔ نہ کہیں افلاس کی شکایت تھی نہ چوری کا کھٹکا تھا قبائلِ انسانی مل کر گذران کرتے تھے اور امن و صلحکاری کے ساتھ اپنے دن کاٹتے تھے۔ یہ مشارکت جو اس ابتدائی تمدن میں انسان کا اصول معاشرت تھی ہمارے ملک کے اکثر دیہات میں اس وقت بھی کسی نہ کسی صورت میں مروج ہے۔ زمانۂ حال کے بعض فلسفی اس بات پر مصر ہیں کہ تمدن کی یہی صورت سب سے اعلےٰ اور افضل ہے۔ نظامِ قدرت میں نوعِ انسانی کے تمام افراد مساوی حقوق رکھتے ہیں کوئی کسی کا ذلیل نہیں ہے اور تمام تمدنی امتیازات مثلاً سرمایہ دار اور محنتی آقا و ملازم وغیرہ بالکل بے معنی ہیں۔

جائدادِ شخصی تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے ابتدائے تمام دنیا کی بیہودگی اسی میں ہے

کہ ان بے جا امتیازات کو یک قلم موقوف کر کے قدیمی اور قدرتی اصول شراکت فی الاشیاء کو مروج کیا جائے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم ملکیت زمین کی صورت میں ہی اس اصول پر عمل درآمد کیا جائے کیونکہ یہ شے کسی خاص فرد یا قوم کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ قدرت کا ایک مشترکہ عطیہ ہے جس میں قوم کے ہر فرد کو مساوی حقِ ملکیت حاصل ہے۔ حال کی علمی بحثوں میں یہ بحث بڑی دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے لیکن ہم اسکا مفصل ذکر اس ابتدائی کتاب میں نہیں کرنا چاہتے۔ یہاں صرف اس قدر یاد رکھنا چاہیئے کہ نظامِ تمدن کی موجودہ صورت میں جائدادِ شخصی ایک ضروری جزو ہے اور پیداوار محنت یعنی دولت کی تقسیم اسی کے وسیلے ہوتی ہے۔ کتاب کے اس حصے میں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کون کون سے اسباب ہیں جن کے عمل سے دولت (اپنی پیدا کرنے والوں کے درمیان) تقسیم ہوتی ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ تمام ممالک میں جہاں دستکاری ایک مرتب و منتظم صورت میں ہے دولت چار حصوں میں تقسیم ہوتی یعنی

(۱) زمیں دار کا حصہ یا لگان۔

(۲) سرمایہ دار کا حصہ یا سود۔

(۳) مالک یا کارخانہ دار کا حصہ یا منافع۔

(۴) محنتی کا حصہ یا اجرت مفتوح ممالک میں دولت کا ایک پانچواں حصہ دار بھی ہوتا ہے یعنی حکمران جس کے حصے کو مالگذاری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ باب ہذا میں ہم صرف لگان کی نسبت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

لگان وہ معاوضہ نقد یا جنس ہے جو زمین کے استعمال کے عوض میں مالک زمین کو ادا کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ معاوضہ بالعموم نقدی یا جنس کی صورت

میں ادا کیا جاتا ہے۔ تاہم خدمت کی صورت میں بھی ادا ہو سکتا ہے جیسے ہندوستان بعض دیہات میں بالکان وہ امام مسجد کو ایک خاص قطعۂ زمین کا کاشت کے لئے دیدیتے ہیں اور اس سے کوئی لگان نہیں وصول کرتے گویا اُس کی مذہبی خدمت ہی لگان تصور کی جاتی ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ زمین جسکے استعمال کے عوض میں لگان ادا کیا جاتا ہے مزروعہ ہی ہو بلکہ لگان ایک وسیع لفظ ہے جسکا اطلاق کانوں چراگاہوں اور حقوق آب پاشی وغیرہ کی صورت میں بھی ہوتا ہے۔

اس مقام پر تم قدرتاً یہ سوال کروگے کہ لگان کی مقدار کس طرح متعین ہوتی ہے یا وہ کون سے اسباب ہیں جو اس کی مقدار کی تعیین میں اثر رکھتے ہیں؟ تم اس کتاب کے کسی گذشتہ باب میں پڑھ آئے ہو کہ قانونِ طلب و رسد ایک ایسا اقتصادی قانون ہے جسکے عمل سے ہر شے کی قیمت متعین ہوتی ہے۔ لگان کی مقدار بھی اس وسیع قانون کے عمل سے آزاد نہیں ہے البتہ بعض ممالک میں اختلافِ حالات کے سبب سے اس قانون کا عمل کامل طور پر نہیں ہوسکتا صوبجاتِ متحدہ امریکہ میں اور علےٰ ہٰذا القیاس کینیڈا اور اسٹریلیا میں چونکہ زمیندار اور کاشتکاروں کے درمیان ایک بلاقید اور آزاد مقابلہ ہے اسواسطے وہاں کے لگان اسی قانون کے عمل سے متعین ہوتے ہیں۔ انگلستان میں چونکہ کاشتکاروں کے ساتھ بسا اوقات ہمدردی کی جاتی ہے اسواسطے قانونِ مذکور پورے طور پر اپنا عمل نہیں کرسکتا کیونکہ زمیندار کاشتکاروں کو کئی طرح کی رعایات دیدینے کے باعث اقتصادی معنوں میں پوری مقدار لگان کی حاصل نہیں کرسکتے۔ آئرلینڈ میں زمینداروں اور کاشتکاروں کے قومی اور مذہبی اختلافات اور کاشتکاروں کی آبادی بڑھ جانے کے باعث مقابلہ کی کوئی انتہا

نہیں ہی جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بیچارے کاشتکار اندازہ سے زیادہ لگان ادا کرنے پر مجبور ہو جانے کے سبب سے ہمیشہ زمینداروں کے مقروض رہتے ہیں اور روز بروز مفلس ہوتے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں مزارعین کی کئی اقسام ہیں یعنی تابع مرضی میعادی یا غیر میعادی اور مزارعین موروثی جنکو اس زمین پر جسکو وہ کاشت کرتے ہیں ایک خاص قسم کا حق ملکیت حاصل ہوتا ہے۔ مقدم الذکر مزارعین کی صورت میں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لگان کی تعیین قانون طلب و رسد کے عمل پر انحصار رکھتی ہے مگر موخر الذکر قسم کے مزارعین کے لگان کی مقدار قانوناً مقرر ہے اور بعض خاص صورتوں کے سوائے اس مقررہ مقدار میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ نظری لحاظ سے ہماری ہندوستان میں سرکار خود زمیندار ہے۔ اور ہمیشہ اس امر میں ساعی رہتی ہے کہ مزارعین کی حقیت اراضی ہر طرح سے محفوظ ہو۔

یاد رکھنا چاہئے کہ زمین کی قیمت اور اس کے لگان کے درمیان ایک ضروری تعلق ہے۔ زمین کی قیمت صرف اسی وجہ سے ہے کہ اس سے لگان ملتا ہے اگر لگان نہ ہوتا تو قیمت بھی نہ ہوتی لیکن اگرچہ یہ تعلق بڑا ضروری ہے بلکہ ایک طرح سے وہی تعلق ہے جو علت و معلول کے درمیان ہوتا ہے تاہم قیمت زمین اور لگان کی درمیانی نسبت مختلف ممالک میں مختلف ہوتی ہے بعض ممالک میں جہاں سرمائے کی مقدار بہت ہے اور انسانی حقوق ہر طرح سے محفوظ ہیں۔ اور زمین کی ملکیت سے ایک تمدنی امتیاز حاصل ہوتا ہے وہاں زمین کی قیمت اس کے سالانہ لگان سے بیس پچیس بلکہ تیس گنا بھی ہوتی ہے کیونکہ ان ممالک میں خریدار زمین کو صرف لگان ہی کا خیال نہیں ہوتا بلکہ وہ اعزاز و امتیاز بھی اسکے مد نظر ہوتا ہے جو خرید زمین کا ضروری نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

لگان کے متعلق ایک اور ضروری مسئلہ کا یاد رکھنا بھی لازم ہے اور وہ یہ ہے کہ لگان زرعی پیداوار کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے یا بالفاظِ دیگر یوں کہو کہ اگر لگان معاف کر دیئے جائیں تو زرعی پیداوار کی قیمت میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ اس کتاب کے کسی گذشتہ باب میں ہم دو اقتصادی اصول بیان کر آئے ہیں۔

(۱) ایک ہی منڈی میں ایک ہی وقت پر ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت ایک ہی ہوا کرتی ہے۔

(۲) کسی شے کی معمولی قیمت اس شے کی رسد کے اس حصے کے مصارف پیدائش سے متعین ہوتی ہے جو نہایت ناساعد حالات میں پیدا کیا گیا ہو۔ ان ہر دو اصول کو ملحوظ خاطر رکھ کر مندرجہ بالا مسئلے کے سمجھنے کی کوشش کرو تمہیں معلوم ہے کہ انگلستان کو جس قدر غلے کی ضرورت ہوتی ہے وہ سارے کا سارا انگلستان کی زمینوں میں ہی پیدا نہیں کیا جاتا۔ بلکہ بعید المقام ممالک سے لایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انگلستان کو اخراجات انتقال بار برداری کے علاوہ اس غلے کے مصارفِ پیدائش بھی ادا کرنے پڑتے ہیں۔ پس ہر دو مندرجہ بالا اصول کے رو سے ضرور ہے کہ انگلستانی غلے کی قیمت اس غلے کی قیمت کے برابر ہو جو دیگر مقامات سے لایا جاتا ہے کیونکہ ایک ہی منڈی میں ایک ہی شے کی دو مختلف قیمتیں نہیں ہو سکتیں بشرطیکہ ان کے خواص میں کوئی نمایاں فرق نہ ہو۔ لہذا صاف ظاہر ہے کہ جو شخص انگلستان میں ان غیر ممالک کی نسبت جو انگلستان کو غلہ مہیا کرتے ہیں کم مصارف پر غلہ پیدا کر سکتا ہے وہ فائدے میں رہتا ہے کیونکہ انگلستانی غلے کی قیمت اس غلے کی قیمت کے مساوی ہوگی جو دیگر ممالک سے لایا جاتا ہے۔ یہ فائدہ یا تو

مالکِ زمین کا حق ہے یا کاشتکار کا محنتی اور خریدارِ غلہ کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے فرضاً اگر کوئی مالکِ زمین نصف لگان معاف کر دے تو اس کے مزارع یا کاشتکار غلے کو کم قیمت پر فروخت نہیں کرینگے کیونکہ وہ غلۂ مذکور کو قیمت متعارف پر فروخت کر سکتے ہیں۔ مزید براں یہ بھی کوئی ضرور نہیں کہ مزارع مذکور اپنے کھیتوں کے مزدوروں کو زیادہ اجرت ادا کریں کیونکہ اس بات کی کوئی وجہ نہیں کہ مزدورِ مذکور اپنی پہلی اجرت کے عوض کام کرنے پر رضامند نہ ہوں گے۔ پس لگان پیداوار کا وہ حصہ ہے جو زرخیزی کے لحاظ سے ادنیٰ ترین زمین کے اخراجاتِ زراعت نکالکر باقی رہتا ہے۔ اسکا تعلق صرف زمیندار اور کاشتکار سے ہے اور کسی کو اس سے کچھ واسطہ نہیں ہے ممکن ہے کہ زمیندار اپنا لگان مزارع کو دیدے مگر اس صورت میں یہ کاشتکار یعنی مزارع اسے اپنے قبضے میں رکھے گا اور اسے قیمتِ متعارف پر فروخت کرنے سے خود فائدہ اٹھائیگا۔ جب وہ اسے قیمتِ متعارف پر فروخت کر کے خود فائدہ اٹھا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنے کھیت کے مزدوروں کو زیادہ اجرت دیکر یا لگانِ مذکور کو کم قیمت پر فروخت کر کے عام دستکاروں یا غلے کے خریداروں کو فائدہ پہونچائے۔

ہم معلوم کر چکے ہیں کہ جائدادِ شخصی کی صورت میں لگان خود بخود پیدا ہوتا ہے اور نیز ایک خاص اصول ہے جسکے رو سے اس کی مقدار متعین ہوتی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ لگان جائدادِ شخصی کی صورت میں مالکِ زمین کا حق ہے اور مزارع کو صرف اسی صورت میں مل سکتا ہے کہ مالکِ زمین اپنی مرضی سے اسکو عطا کر دے۔ علی ہٰذا القیاس قوانینِ اقتصاد کے رو سے مزارع مذکور اور خریدارِ غلہ کو بھی اس سے کوئی سروکار نہیں ہے جب تک

مزارع اپنی مرضی سے انکو عطا نہ کرے۔ مزید براں یہ امر بھی ظاہر ہے کہ جُوں جُوں آبادی بڑھتی ہے ضرورت ان زمینوں کو کاشت میں لانے پر مجبور کرتی ہے جو اس سے پہلے غیر مزروعہ پڑی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو زمینیں اثرِ اکثرِ آبادی سے پیشتر کاشت کی جاتی تھیں اُن کا لگان بڑھ جاتا ہے زمیندار روز بروز دولت مند ہوتے جاتے ہیں حالانکہ یہ مزید دولت جو ان کو ملتی ہے نہ انکی ذاتی کوششوں اور نہ ان کی زمینوں کے محاصل کی مقدار بڑھنے کا نتیجہ ہوتی ہے بلکہ صرف آبادی کی زیادتی سے پیدا ہوتی ہے۔ انکی ذاتی کوششیں اور ان کی زمینوں کے محاصل کی مقدار میں کوئی فرق نہیں آتا پھر انکا کوئی حق نہیں کہ وہ دولت مند ہوجائیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ آبادی کی زیادتی سے قوم کے خاص افراد کو فائدہ پونچے اور باقی قوم اس سے محروم رہے اگر یہ فائدہ ان کی ذاتی کوششوں یا ان کی زمینوں کے محاصل کے بڑھ جانے کا نتیجہ ہوتا تو ایک بات تھی لیکن جب ان کی دولت مندی کے یہ اسباب نہیں ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ ان کے امیری صریحاً اصولِ انصاف کے خلاف ہے۔ ان نتائج کو ملحوظ رکھکر بعض محققین نے بڑے زور شور سے ثابت کیا ہے کہ یہ سب ناانصافی جائدادِ شخصی سے پیدا ہوتی ہے جسکا وجود قومی بہبودی کے لئے انتہا درجے کا مضرت رساں ہے۔ پس حکماء کے اس فریق کے نزدیک زمین کسی خاص فرد کی ملکیت نہیں بلکہ قومی ملکیت ہونی چاہئیے یا بالفاظِ دیگر یوں کہو کہ لگان کی یہ زائد مقدار جو آبادی کی زیادتی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے سرکار یا قوم کا حق ہے نہ زمینداروں کا۔ یہ ایک بڑی دلچسپ بحث ہے لیکن چونکہ ابتدائی کتاب اس کے لئے موزون نہیں اسواسطے ہم اسکو نظرانداز کرتے ہیں۔

بابِ دوم

ساہوکار کا حصہ یا سود

حصہ دوم میں معلوم ہو چکا ہے کہ سرمایہ بچت کا نتیجہ ہے اور زمین کے فطری قوائے ہوا یا پانی وغیرہ اس میں داخل نہیں۔ ظاہر ہے کہ دولت کی پیداوار کا کچھ حصہ یا بہت زیادہ حصہ دستکاروں سرمایہ داروں اور زمینداروں کی ضروریات پر صرف ہوتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ پیداوار دولت کی تمام و کمال مقدار اسطرح صرف نہ ہو جائے جب تک کہ کوئی ایسی چیز نہ ہو جو دولت کو جذبات نفسانی کے نتیجہ سے چھوڑا کر کسی قوم کی افراد کو جمع کرنے کی ترغیب و تحریص دے۔ مہذب ممالک میں تجارت کی وسعت کے ساتھ جمع کرنے کی خواہش کو بہت تحریک ہوتی ہے کیونکہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میرے پاس سرمایہ ہو جسکو خود کسی کام پر لگا کر نفع اٹھاؤں یا کسی اور کو مستعار دیکر اس کے معاوضے میں سود لوں۔

یہ نفع یا سود جو استعمال سرمایہ کے عوض میں ادا کیا جاتا ہے جمع کرنے کا ایک زبردست محرک ہے تاہم اقوام دنیا کے مختلف افراد پر اس کا اثر مختلف ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سود زر نقد یا روپے کے استعمال کے عوض میں ادا کیا جاتا ہے مگر حقیقت میں یہ صحیح نہیں کیونکہ اصل مطلب زر نقد نہیں ہے بلکہ وہ اشیاء ہیں جو زر نقد مستعار کی وساطت سے حاصل کی جاتی ہیں اور جنکو بطور سرمایہ استعمال کیا جاتا ہے مزید براں زمانہ حال میں تجارت کے [illegible] یا [illegible] پر چلتے ہیں اسواسطے خود نقد [illegible] کی

کبھی کبھی ضرورت پڑتی ہے پس سود استعمال زر نقد کے عوض میں نہیں بلکہ استعمال سرمایہ کے معاوضے میں ادا کیا جاتا ہے لہذا اسکی مستقل شرح اس نسبت پر منحصر ہے جو کسی ملک میں قرضوں کی مانگ اور سرمائے کی اس مقدار کے درمیان ہو۔ جو سود پر دی جا سکتی ہو۔ شرح سود کی زیادتی کمی سرمایہ پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس کی کمی زیادتی سرمایہ پر جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شرح سود کی زیادتی اقتصادی لحاظ سے غیر مفید نہیں کیونکہ سرمایہ بچت کا نتیجہ ہے اور شرح سود اس بچت کا انعام ہے لہذا جس قدر شرح سود زیادہ ہوگی اسی قدر لوگوں کو جمع کرنے کی تحریک ہوگی اور سرمائے کی مقدار بڑھتی جائیگی۔

پس صاف ظاہر ہے کہ کسی ملک میں ایسے قوانین کا وضع ہونا جن کا منشا شرح سود کو کم کرنا یا اسکی زیادتی کو روکنا ہو۔ گویا ان اسباب کے عمل کو روکنا ہے جن کی وساطت سے سرمائے کی رسد بڑھتی ہے مگر برعکس اس کے یہ نہ سمجھ لینا کہ کسی ملک میں شرح سود کی کمی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہاں کی تمدنی حالت ہر طرح سے محمود ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ شرح سود کی کمی سرمائے کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ بھی تو نکل سکتا ہے کہ سرمائے کی مقدار اس سرعت اور تیزی کے ساتھ بڑھتی ہے کہ اب اس کے بارآور استعمال کی کوئی مزید صورت رہی ہی نہیں نظام تمدن کا شیرازہ ایسا بگڑ گیا ہے۔ اور لوگ اس قدر کاہل و آرام طلب ہو گئے ہیں کہ نئے نئے تجارتی اور صنعتی مشاغل کا بار اٹھانے کی تکلیف گوارا نہیں کر سکتے۔

شرح سود کی زیادتی کے کئی اسباب میں لوگ ممالک غیر میں اپنا سرمایہ سود پر نہیں دیتے جب تک کہ زیادہ شرح سود نہ ملے یہی وجہ ہے کہ اکثر ممالک میں شرح سود کی مقدار مساوی نہیں ہوتی مزید براں شرح سود کی مقدار

اس منافع پر بھی انحصار رکھتی ہے جو سرمائے کے استعمال سے حاصل ہو۔ ملک
اسٹریلیا کے کسانوں کو زراعت سے بیس فی صدی منافع حاصل ہوتا ہے
اسواسطے وہ لوگ سرمایۂ مستعار کے عوض میں شرح سود کی ایک بہت
زیادہ مقدار دے سکتے ہیں بہ نسبت اُن ممالک کے جہاں زراعت سے
اس قدر منافع حاصل نہیں ہوتا علے ہذالقیاس اشیار خوردنی کی ارزانی
مصارفِ محنت کو کم کر کے منافع کی مقدار کو زیادہ کرتی ہے جس سے شرح
سود کی مقدار بھی بڑھتی ہے برخلاف اس کے سونے چاندی کی نئی نئی کانوں
کا دریافت ہو جانا سرمائے کی رسد کو زیادہ کرتا ہے اس واسطے شرح سود
کی مقدار کم ہو جاتی ہے اور نیز کسی ملک کے مختلف بنکوں کا باہمی مقابلہ
بھی جو ہمیشہ اپنے اپنے سرمائے کو لگانے کے فکر میں رہتے ہیں شرح سود کی
مقدار کو کم کرتا ہے زمانۂ حال میں مندرجہ ذیل اسباب کے اثر سے شرح سود
زیادہ ہوتی گئی ہے۔

(۱) وسائلِ آمد و رفت کی سہولت سے لوگوں کو غیر ممالک میں سرمایہ
منتقل کرنا آسان ہو گیا ہے۔ جس ملک سے سرمایہ منتقل ہو گا وہاں اسکی
رسد کم ہوتی جائے گی لہذا اس ملک میں شرح سود بڑھے گی۔

(۲) مختلف ممالک کے ارکانِ سلطنت اخراجاتِ جنگ اور دیگر
رفاہِ عام کاموں میں روپیہ صرف کرنے کے لئے رعایا سے قرض اٹھاتے ہیں۔
اگر ایسا نہ ہوتا تو سرمائے کی یہ مقدار ملک میں عام طور پر مستعار دی جاتی جس
سے شرحِ سود کی مقدار بہ سبب زیادتی رسدِ سرمایہ کم ہو جاتی۔

(۳) دیگر ممالک سے اشیار خوردنی وغیرہ کا خرید کرنا کسی ملک کے
سرمائے کی مقدار کو کم کرتا ہے جس سے اس ملک میں شرح سود کی مقدار

بڑھ جاتی ہے۔

(۴) چونکہ مشترک سرمائے والی کمپنیاں جائز تصور کی گئی ہیں اس واسطے ساہوکاروں میں سے اکثر لوگوں نے متفق ہو کر تجارتی کمپنیاں قائم کر لی ہیں لہذا سرمائے کی وہ مقدار جو پہلے سود پر اوروں کو دی جا سکتی تھی تجارت کی مختلف شاخوں میں الگ کی گئی ہے جس سے اس سرمائے کی مقدار کم ہو گئی ہے جو مستعار دیا جا سکے لہذا شرح سود بڑھ گئی ہے۔

تم شاید یہ سمجھو گے کہ شرح سود اور لگان دونوں ایک ہی جنس کی نوعیں ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جوں جوں آبادی زیادہ ہوتی ہے تہذیب و تمدن ترقی کرتے ہیں اور دولت کی پیداوار بڑھتی ہے توں توں جیسا کہ ہم باب گذشتہ میں بیان کر آئے ہیں لگان کی مقدار بڑھتی جاتی ہے لیکن شرح سود ان حالات میں بوجہ افزائش سرمایہ کم ہوتے جانے کا میلان رکھتی ہے۔ علی ہذا القیاس لگان اور سود میں ایک یہ بھی ضروری فرق ہے کہ مقدم الذکر جیسا کہ ہم ثابت کر آئے ہیں اشیاء کی قیمتوں کا کوئی جزو نہیں ہے لیکن موخر الذکر ان کی قیمتوں کا جزو ہے کیونکہ شرح سود کی کمی بیشی اس منافع کی کمی بیشی پر انحصار رکھتی ہے جو تجارت کی کسی شاخ پر سرمایہ لگانے سے حاصل ہوتی ہے اور منافع کی بیشی اشیاء کی قیمتوں کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔

اکثر صورتوں میں ساہوکاروں کو اپنے قرضداروں پر پورا اطمینان نہیں ہوتا بلکہ بعض صورتوں میں ان کو سرمائے کی عدم ادائگی یا کسی اور قسم کے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے اس واسطے وہ اپنے قرضداروں کو شرح سود کی ایک غیر معمولی مقدار پر سرمایہ قرض دیتے ہیں۔ اس غیر معمولی شرح سود کو جو احتمال عدم ادائگی یا نقصان کے اندیشے کی وجہ سے حاصل کی جاتی ہے مطالبۂ نقصان

میں سود کاذب کہتے ہیں کیونکہ شرح سود کی اصلی اور صحیح مقدار وہی ہے جسکی تعین میں کسی قسم کے اندیشۂ نقصان کو دخل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ایک تجارتی مرکز میں شرح سود کی مقدار کہیں کچھ اور کہیں کچھ ہوتی ہے۔ قیمتِ اشیاء کے متعلق تم ایک اقتصادی اصول پڑھ چکے ہو کہ ایک ہی منڈی میں ایک ہی وقت پر ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت ایک ہی ہوتی ہے مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اصول شرح سود یا بالفاظِ دیگر اس قیمت کے متعلق صحیح نہیں ہے جو استعمال سرمایہ کے عوض میں دی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شرح سود کی تعیین میں بسا اوقات احتمالِ نقصان کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ جہاں روپے کے ضائع ہو جانے کا احتمال ہو وہاں ساہوکار زیادہ شرح سود لیتے ہیں اور جہاں نقصان کا احتمال کم ہو یا بالکل نہ ہو یا بالفاظِ دیگر یوں کہو کہ جہاں ان کو روپے کے واپس مل جانے اور سود کے باقاعدہ ادا ہوتے رہنے کا پورا یقین ہو وہاں کم شرح سود پر رضامند ہو جاتے ہیں۔ اِس کے علاوہ چونکہ لوگ بالعموم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ دنیا میں ان کا بھرم نہ نکل جائے اِس واسطے حتی المقدور مستعار سرمایہ لینے کو اوروں سے چھپاتے ہیں اور اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ مختلف ساہوکاروں کے درمیان ایک قسم کی تجارتی ضد یا مقابلہ پیدا کر دیں جس سے شرح سود کی مقدار کم ہو جائے۔ اور ان کو فائدہ پہنچے لہٰذا مستعار سرمایہ لینے والوں کو حالات کا پورا علم نہیں ہوتا اور ساہوکاروں کے درمیان باہمی مقابلہ کامل طور پر اپنا اثر نہیں دکھا سکتا جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مختلف ساہوکار شرح سود کی مختلف مقداروں پر روپیہ قرض دیتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس دنیا کے مختلف تجارت گاہوں میں بھی شرح سود کے اختلاف کے اسباب یہی ہیں جو بیان ہوئے مگر اس خاص صورت میں [illegible]

اور باعث بھی ہے یعنی ساہوکار عموماً اپنا سرمایہ غیر ممالک کے لوگوں کو مستعار نہیں دیتے جس سے شرح سود میں مقامی اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں کیونکہ ان کو اور باتوں کے علاوہ یہ خیال بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ اگر کسی سبب سے سرمایۂ مستعار کی وصولی وغیرہ کے لئے عدالت تک نوبت پہنچی تو اجنبیوں کے ساتھ جھگڑا ارگڑا کرنے میں خواہ مخواہ کی دقت ہوگی۔ بسا اوقات اقوام کا باہمی تعصب اور بدظنی اور قابلِ اعتماد دلالوں کا دستیاب نہ ہوسکنا بھی ساہوکار کو غیر ممالک میں اپنا سرمایہ لگانے سے روکتا ہے۔ مزید براں ان کو فطرتاً یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اپنے وطن میں شرح سود کی تھوڑی سی مقدار پر اکتفا کرنا اچھا ہے بجائے اس کے کہ سرمایہ دیگر ممالک میں منتقل کریں جہاں کے حالات کا کافی علم نہ ہونے کی وجہ سے نقصان کا احتمال ہے۔

باب سوم

مالک یا کارخانہ دار کا حصہ یا منافع

پیدائشِ دولت کا تیسرا حصہ دار مالک یا کارخانہ دار ہے جو صنعت کی مختلف شاخوں کو مرتب و منظم کرتا ہے اور جس کا فرض علاوہ دیگر فرائض کے ایک اس امر کا فیصلہ کرنا بھی ہوتا ہے کہ کون کون سی اشیاء کس کس مقدار میں تیار کی جائینگی اور کس قیمت پر فروخت کی جائینگی۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ تمدنِ انسانی کے ابتدائی مراحل میں مالک یا کارخانہ دار کا وجود ضروری نہیں ہوتا لیکن پیدائشِ دولت کی مختلف صورتوں کا پیچیدہ ہوتے جانا کلوں کی ایجاد اور تجارت کی وسعت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ کوئی فرد ایسا بھی ہو۔ جو دست کاری کے کاروان کے لئے قافلہ سالار کا کام دے۔ اور جس کا ذاتی تجربہ انتظامی قوت اور تجارت کی نشیب و فراز سے واقف ہونا صنعت کی روز افزوں پیچیدگیوں کو سلجھاتا رہے تم جانتے ہو تمدن کی اعلےٰ صورتوں میں جب کہ صنعت انتہا درجے کی ترقی کر جاتی ہے یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص جس کے پاس سرمایہ موجود ہو۔ مالک یا کارخانہ دار کا کام بھی دے سکے کیونکہ کارخانہ داری کے لئے دیگر اوصاف کے علاوہ ایک خاص قسم کی انتظامی قوت۔ عاقبت بینی اور ذمہ داریوں کا بار اٹھا سکنے کی قابلیت لازم ہے جس سے بالعموم ہر سرمایہ دار متصف نہیں ہوتا لہٰذا جس طرح سرمایہ مہیا کرنے کے عوض میں ساہوکار یا سرمایہ دار کو ایک خاص معاوضہ ملتا ہے جو شرح سود کہلاتا ہے اسی طرح پیدائش دولت کے سلسلے میں

کارخانہ دار کو بعض فرائض کی انجام دہی کے لئے ایک خاص معاوضہ ملتا ہے جس کو منافع کہتے ہیں اکثر محققینِ اقتصاد نے کارخانہ دار اور سرمایہ دار یا ساہوکار یا یوں کہو کہ منافع اور سود میں کوئی امتیاز نہیں کیا اس واسطے وہ منافع کو استعمال سرمایہ کا معاوضہ سمجھتے ہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ کارخانہ دار کو ملتا ہے اسے محض اجرتِ انتظام و نگرانی وغیرہ تصور کرتے ہیں لیکن صاف ظاہر ہے کہ پیدائش دولت کے سلسلے میں سرمایہ دار اور کارخانہ دار مختلف اقسام کے فرائض ادا کرتے ہیں اور موخر الذکر کا حصہ ایسا بے حقیقت نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کرایا جائے۔ بلکہ اقتصادی لحاظ سے اسے اجرت کے نام سے موسوم کرنا ہی غلط ہے۔ جیسا کہ ابھی واضح ہوگا ہر کارخانہ دار جس میں کارخانہ داری کے اوصاف موجود ہیں سرمایہ دار بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اوروں سے کسی خاص شرح سود پر سرمایہ حاصل کر سکتا ہے خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ تجارتی کاروبار کا زیادہ تر حصہ اعتبار پر چلتا ہے مگر ہر سرمایہ دار یا ساہوکار کارخانہ دار نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اوصاف جو کارخانہ داری کے لئے ضروری ہوتے ہیں ہر سرمایہ دار میں موجود نہیں ہوتے ہاں اگر کسی سرمایہ دار یا ساہوکار میں کارخانہ داری کے اوصاف موجود ہوں تو وہ دونوں کے فرائض کو انجام دیکر دگنا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

تم جانتے ہو کسی شے کے مصارفِ پیدائش سے مراد ان اخراجات کی ہے جو اس شے کی تیاری اور اس کو خرید و فروخت کے مقام وغیرہ پر لانے میں صرف ہوتے ہیں کارخانہ دار کی خواہش اور امید یہ ہوتی ہے کہ اس شے کی قیمت فروخت با قدر اس کے مصارفِ پیدائش سے بڑھ جائے لہذا منافع اس فرق کے برابر ہوتا ہے جو کسی شے کی قیمت فروخت

اور اس کے مصارف پیدائش کے درمیان ہو بشرطیکہ مقدم الذکر موخر الذکر سے مقدار میں زیادہ ہو کیونکہ اگر قیمتِ فروخت مصارف پیدائش سے کم ہوگی تو اس سے کارخانہ دار کو منافع نہیں ہوگا بلکہ گھاٹا ہوگا تجارتِ اشیاء میں یہ نفع جو کارخانہ دار کو ہوتا ہے منافع کہلاتا ہے اور قرضوں کی تجارت کی صورت میں اس نفع کو منافع کے نام سے نہیں بلکہ سود یا منی کلاٹے کے نام سے موسوم کرتے ہیں وسیع معنوں میں منافع کا مفہوم یہی ہے جو بیان ہوا مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ منافع کی حقیقت پر بحث کرنے والوں میں سے بعض نے ایک بڑی غلطی کھائی ہے۔ جس طرح شرح سود سے مراد ایک خاص مقدار کی ہے جو سرمائے کو ایک خاص مدت تک استعمال کرنے کے عوض میں ادا کی جاتی ہے اسی طرح شرح منافع سے مراد منافع کی ایک خاص مقدار ہے جو ایک خاص مدت میں حاصل ہو۔ مگر بعض محققین غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ شرح منافع کی تعیین میں مدت کو کوئی دخل نہیں ہے اور شرح منافع صرف مقادیر منافع اور سرمائے کی درمیانی نسبت پر منحصر ہے مگر یہ رائے صریحاً غلط ہے فرضاً اگر میں تجارت کی کسی شاخ پر سو روپیہ سرمایہ لگاؤں اور مجھے پانچ روپے یومیہ منافع ہو۔ تو صاف ظاہر ہے کہ شرح منافع فی ماہ ۱۵۰ روپیہ فی صدی ہے لیکن اگر اس قدر منافع دو ماہ کی میعاد میں حاصل ہو تو شرح منافع ۷۵ روپے فی صدی فی ماہ ہوگی نہ ۱۵۰ فی صدی لہٰذا شرح منافع کی مقدار نہ صرف سرمائے کی مقدار پر منحصر ہے بلکہ اس مدت پر بھی انحصار رکھتی ہے جس میں منافع کی کل مقدار حاصل ہو۔ جس قدر کسی شے کی قیمت فروخت اس کے مصارف پیدائش سے زیادہ ہوگی اسی قدر شرح منافع کی مقدار بھی زیادہ ہوگی اور جس قدر قیمت فروخت کم ہوگی اسی قدر شرح منافع کی مقدار بھی کم ہوگی۔

علےٰ ہٰذا القیاس اگر اس مدت کی مقدار جس میں کل منافع حاصل ہوا ہے کم ہوگی تو شرح منافع کی مقدار زیادہ ہوگی اور اگر مقدم الذکر کی مقدار زیادہ ہوگی تو مؤخر الذکر کی مقدار کم ہوگی مثلاً اگر سرمایہ کی کسی خاص مقدار کے عوض دو ماہ میں پچاس روپیہ منافع ہو۔ تو شرح منافع فی ماہ پچیس روپیہ ہوگی لیکن اگر یہ پچاس روپیہ منافع پانچ ماہ میں حاصل ہو۔ تو ظاہر ہے کہ شرح منافع فی ماہ دس روپیہ ہوگی لہٰذا شرح منافع کی متعلق یہ ضروری اصول قائم ہوا کہ "شرح منافع مصارف پیدائش اور اس مدت کے ساتھ جس میں منافع کی مقدار حاصل ہو نسبت معکوس رکھتی ہے"۔ اس ذرا سی بات کو نہ سمجھنے کے باعث بعض محققین نے بڑی بھی غلطیاں کھائی ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ منافع کی مقدار صرف اسی صورت میں زیادہ ہوسکتی ہے جبکہ اجرت کی مقدار کم ہو۔ اور اسی صورت میں کم ہوسکتی ہے جبکہ اجرت کی مقدار زیادہ ہو۔ لہٰذا ان حکما کے نزدیک کارخانہ داروں اور محنتیوں کے سود و زیاں کے درمیان ایک قسم کا ضروری تناقض ہے یا یوں کہو کہ ایک کا نفع اور دوسرے کا نقصان ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر ثابت کیا ہے شرح منافع کی تعیین میں مدت کو بھی بڑا دخل ہے یعنی اگر سرمایہ اور منافع کی مقادیر میں کوئی تغیر پیدا نہ ہو۔ تو جس مدت میں منافع کی ایک خاص مقدار حاصل ہوتی ہے اس مدت کے کم ہوجانے یا یوں کہو کہ اشیاء تجارتی کے بہت جلد فروخت ہوجانے سے شرح منافع بڑھ جاتی ہے اور اس مدت کی زیادتی سے شرح منافع کم ہوجاتی ہے خواہ اجرت کی مقدار میں فرق پیدا ہو یا نہ ہو علےٰ ہٰذا القیاس یہ بھی ممکن ہے کہ اجرت کی مقدار بڑھ جاوے اور منافع کی مقدار کم ہوجائے۔ مگر باوجود اس کے شرح منافع زیادہ ہوجائے مثلاً فرض کرو کہ سرمایہ ایک سو پونڈ کے برابر ہے اور منافع سالانہ بیس پونڈ ہے اگر بیس

پونڈ منافع ایک ماہ میں حاصل ہو تو ظاہر ہے کہ شرح منافع کی مقدار ۲۴۰ پونڈ سالانہ فی صدی ہوگی۔ فرض کرو کہ شرح منافع میں اس قدر زیادتی ہو جانے سے سرمایہ دار پانچ پونڈ بطور اجرت ادا کرتا ہے اس صورت میں مصارف پیدائش ۵ء۱۰۵ پونڈ ہوئے اور منافع ماہانہ ۴ء۳ یا قریباً ۵ء۱ پونڈ فی صدی ہوا۔ لہٰذا شرح منافع ۱۶۷ پونڈ سالانہ فی صدی سے بھی زیادہ ہوئی لیکن فرض کرو کہ مدتِ منافع اس سے بھی بڑھ گئی ہے اور منافع کی مقدار بجائے بیس پونڈ فی ماہ کے بیس پونڈ فی یوم ہوگئی یا یوں کہو کہ شرح منافع ۷۳۰۰ پونڈ سالانہ فی صدی ہے اگر شرح منافع میں اس قدر زیادتی ہو جانے سے ۱۰ پونڈ بطور اجرت ادا کئے جاویں تو ظاہر ہے کہ ۱۱۰ پونڈ لگانے پر ۱۰ پونڈ یومیہ منافع ہوگا جس کے یہ معنے ہیں کہ شرح منافع فی یوم ۹ فی صدی سے زیادہ یا ۳۳۱۸ سالانہ فی صدی سے زیادہ ہے اس مثال سے ظاہر ہے کہ اُس مدت کی کمی سے جس میں منافع کی کوئی خاص مقدار حاصل ہوتی ہے اجرت اور شرح منافع ایک ساتھ بڑھ سکتے ہیں اگرچہ منافع مجموعی حصہ کم ہی کیوں نہ ہوتا جائے لہٰذا دستکاروں و خریداروں اور کارخانہ داروں کے نفع و نقصان کے درمیان کوئی تناقض نہیں ہے اور شرح منافع مفصلہ ذیل اسباب پر منحصر ہے۔

(۱) وہ تمام اسباب جو اشیاء تجارتی کے مصارفِ پیدائش کو کم کرتے ہیں منافع کی کل مقدار کو زیادہ کرتے ہیں جس کے یہ معنے ہیں کہ شرح منافع بھی اسی نسبت سے زیادہ ہوتی ہے مگر مصارفِ پیدائش صرف اسی صورت میں کم ہو سکتے ہیں کہ

(۱) دستکار کی کارکردگی بڑھ جائے اور اس کی اجرت بدستور وہی رہے۔

(۲) اجرت کم ہو جائے اگرچہ محنت کی کارکردگی اور اشیاء خوردنی وغیرہ

کی قیمت خرید بدستور ہی رہے۔

(۳) اشیاء خوردنی وغیرہ ارزاں ہو جائیں مگر دستکار کو ان کی اس قدر مقدار مل سکے جو پیشتر ملا کرتی تھی برخلاف اس کے اگر کمی تعلیم یا سرمایہ قائم مثلاً کلوں وغیرہ کے تلف ہو جانے یا دستکار کی جسمانی قوت میں زوال آجانے کے باعث محنت کی کارکردگی کم ہو جائے یا دستکار کی اجرت بڑھ جائے مگر اشیاء خوردنی ارزاں نہوں یا اجرت بدستور ہی رہے اور اشیاء خوردنی وغیرہ گراں ہو جائیں تو منافع کی مقدار کم ہو گی جس کے یہ معنے ہیں کہ شرح منافع کی مقدار بھی اسی نسبت سے کم ہو گی بشرطیکہ اس مدت میں کوئی تغیر نہو جس میں کل منافع کی مقدار حاصل ہوتی ہے۔

(ب) شرح منافع کی تعیین میں چونکہ مدت کو بھی دخل ہے لہذا اگر وہ مدت جس میں منافع کی کوئی خاص مقدار حاصل ہوتی ہے کم ہو جائے تو شرح منافع زیادہ ہو گی۔ منافع کی زیادتی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مصالح جس سے تجارتی اشیاء تیار ہوتی ہیں۔ مانگ کی بڑھ جانے کی وجہ سے گراں ہو جاتا ہے۔ اور لوگ تجارت کی دیگر شاخوں سے اپنا سرمایہ نکال کر اس خاص شاخ میں لگانا شروع کر دیتے ہیں جہاں شرح منافع نسبتاً زیادہ ہے مگر یہ حالت دیر تک نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ سرمائے کی زیادتی سے اشیاء کی رسد ان کی مانگ سے بڑھ جاتی ہے لہذا قیمتیں کم ہو جاتی ہیں اور شرح منافع اپنی پہلی حالت پر عود کر آتی ہے بلکہ بسا اوقات معمول سے کم بھی ہو جاتی ہے۔

ماہیت منافع کی مزید توضیح کے لئے محقق واکر لکھتا ہے کہ اگرچہ لگان اور سود ان کا فرق پہلے واضح ہو چکا ہے) میں بڑا فرق ہے تاہم منافع اور لگان ایک ہی جنس کی دو نوعیں ہیں جس طرح لگان کی مقدار بسبب زمین کی غیر معمول زرخیزی

اور اسکا کسی خاص مناسب مقام پر واقع ہوتا ہے اسی طرح منافع کی مقدار بھی کارخانہ دار کی ذاتی قابلیت اور اس کی غیر معمولی انتظامی قوت و عاقبت اندیشی پر انحصار رکھتی ہے۔ علی ہذا القیاس جس طرح متقدم الذکر کی تعیین میں مختلف زمینوں کے لگانوں کا باہمی مقابلہ بڑا دخل رکھتا ہے اسی طرح مختلف کارخانداروں کے منافع کی مقدار کے معین کرنے میں بھی ان کے اوصاف کا باہمی مقابلہ بڑا دخل رکھتا ہے جسطرح بعض ایسی زمینیں ہیں جو کم لگان ادا کرتی ہیں اسی طرح بعض ایسے کارخانہ دار بھی ہیں جو کم منافع حاصل کرتے ہیں ہر ملک میں سینکڑوں ایسے تاجر یا کارخانہ دار ہیں جو حقیقت میں ان اوصاف سے بے بہرہ ہیں جو کارخانہ داروں کے لئے ضروری ہیں اور جن کا منافع بمشکل ان کے گذارہ کے لئے کافی ہوتا ہے پس اقتصادی استدلال کے لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے کارخانہ داروں کو منافع کچھ نہیں ہوتا اس توضیح سے حقیقتِ منافع کے متعلق دو نہایت اہم نتائج نکلتے ہیں جن کو ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے۔

(۱) منافع اشیاء صنعتی کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ یہ اس دولت کا ایک حصہ ہے جو کارخانہ دار کی ذاتی قابلیت اور اس کی غیر معمولی قوت انتظام کی وساطت سے پیدا ہوتی ہے تمہیں معلوم ہوگا کہ لگان زرعی پیداوار کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ اس دولت کا ایک حصہ ہے جو زمین کی غیر معمولی زرخیزی اور اس کے کسی خاص مقام پر واقعہ ہونے سے پیدا ہوتی ہے جس استدلال کی بنا پر یہ بات لگان کے متعلق صحیح ثابت کی گئی تھی اسی استدلال کی رو سے یہ بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ منافع اشیاء صنعتی کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے صنعتی اشیاء کی قیمت اشیاء مذکور کے اس حصہ کے مصارفِ پیدائش سے متعین ہوتی ہے جو نہایت ناساعد حالات میں پیدا کیا گیا ہو لیکن چونکہ اقتصادی

اصولوں کے رو سے ایک ہی منڈی میں ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت ایک وقت پر ایک ہی ہوتی ہے لہذا صاف ظاہر ہے کہ جو کارخانہ دار اُن کارخانہ داروں کی نسبت جو نہایت ناساعد حالات میں کام کرتے ہیں کم مصارف پر اشیا صنعتی تیار کر سکتے ہیں وہ منافع حاصل کرینگے کیونکہ قیمت اشیاء دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے اور مصارف پیدائش ایک صورت میں کم اور دوسری میں زیادہ ہیں۔

(۲) علےٰ ہٰذا القیاس یہ صحیح نہیں ہے کہ کارخانہ دار کا منافع صرف اسی صورت میں بڑھ سکتا ہے جبکہ اجرت کم ہو۔ کیونکہ اجرت کی جو مقدار ان کارخانہ داروں کو ادا کرنی پڑتی ہے جو اوصاف کارخانہ داری سے مزین ہونے کے باعث منافع حاصل کرتے ہیں وہی مقدار اوروں کو بھی ادا کرنی پڑتی ہے جو ان اوصاف سے معرا ہونے کے باعث اقتصادی لحاظ سے کوئی منافع حاصل نہیں کرتے یا صرف برائے نام منافع حاصل کرتے ہیں اجرت کی مقدار دونوں میں مساوی ہے مگر ایک صورت میں منافع ہوتا ہے۔ دوسرے میں کوئی منافع نہیں ہوتا یا صرف برائے نام منافع ہوتا ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ حصولِ منافع کارخانہ دار کی ذاتی قابلیت کا نتیجہ ہے۔

جس طرح عمدہ زمینوں کا لگان بری زمینوں کے لگان سے مقدار میں زیادہ ہوتا ہے اسی طرح ہوشیار اور معاملہ فہم کارخانہ داروں کا منافع ان کارخانہ داروں کے منافع سے زیادہ ہوتا ہے جو اوصاف کارخانہ داری سے معرا ہوتے ہیں۔ آبادی و تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ادنےٰ درجے کی زمینیں کاشت میں لائی پڑتی ہیں اور زرخیز قطعات زمین کا لگان بڑھتا جاتا ہے علےٰ ہٰذا القیاس جوں جوں ایسے کارخانہ داروں کی تعداد بڑھتی ہے جو اوصاف کارخانہ داری سے

معرا ہیں تو ان کارخانہ داروں کا منافع بڑھتا ہے جو ان اوصاف سے بہرہ ور ہیں کیونکہ کارخانہ دار کی ناقابلیت کی وجہ سے مصارف پیدائش بڑھ جاتے ہیں۔

اس ضمن میں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ کسی ملک کا تہذیب و تمدن میں ترقی کرنا اس امر کا مقتضی ہے کہ وہاں شرح منافع روز بروز کم ہوتی جانے کا میلان رکھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے ملک میں ناقابل کارخانہ داروں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے لہذا ان کارخانہ داروں کا منافع روز بروز کم ہوتا جاتا ہے جو ذاتی قابلیت کا جوہر رکھتے ہیں کیونکہ ان کے منافع کی زیادتی ناقابل کارخانہ داروں کی تعداد پر منحصر ہے۔ علاوہ اس کے ایسے ملک میں عام لوگ دور اندیش ہو جاتے ہیں جس سے سرمایہ زیادہ زیادہ جمع ہو جاتا ہے لہذا اس کی رسد بڑھتی جاتی ہے اور شرح منافع کم ہوتی جاتی ہے کیونکہ شرح منافع کی زیادتی کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ سرمایہ کی رسد کم ہو۔ مزید براں تہذیب و تمدن کی ترقی سے آبادی بڑھتی ہے جس سے ادنے نیچے کی زرخیز زمین کاشت میں لانی پڑتی ہیں لہذا مصارف پیدائش اور اشیاء خوردنی کی قیمت بڑھ جاتی ہے جس سے شرح منافع کی مقدار بھی کم ہو جاتی ہے مگر تم کہو گے کہ اگر یہ صحیح ہے تو انگلستان میں تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ شرح منافع پر کیوں بڑا اثر نہیں ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انگلستان کے سرمایہ کا بہت سا حصہ غیر ممالک میں لگا ہوا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ خود انگلستان میں سرمایہ کی رسد کم ہے۔ انگلستان میں دستکاری کی ترقی اور اشیاء خوردنی کی ارزانی کے باعث جو دیگر ممالک سے آتی ہیں مصارف محنت کی مقدار زیادہ نہیں ہوئی لہذا اس ملک میں شرح منافع میں نہایت خفیف کمی واقع ہوئی ہے۔

چونکہ دستکار بالعموم کارخانہ دار کے نفع کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اسواسطے بعض محققینِ اقتصاد دستکاروں کے فائدے کو مدِ نظر رکھ کر یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اگر دستکار خود ہی منتظم ہو۔ اور خود ہی کارخانہ دار ہو تو دستکاری کے موجودہ انتظام میں کارخانہ دار کا وجود ضروری نہ ہوگا اور وہ منافع جو موجودہ صورت میں کارخانہ دار کی جیب میں جاتا ہے دستکار کو ملیگا۔ یہ طریق اصولِ معاونت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جسکا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

باب پنجم

محنتی کا حصہ یا اُجرت

پیداوار دولت کا چوتھا حصہ دار دستکار یا محنتی ہے جسکا معاوضہ محنت اجرت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مگر پیشتر اس کے کہ ہم وہ اصول معلوم کریں جس کے عمل پر اجرت کی کمی بیشی کا انحصار ہے ۔ دو ضروری امتیاز ذہن نشین کرنے کے قابل ہیں تاکہ مضمون زیر بحث کے سمجھنے میں آسانی ہو ۔

(۱) ظاہری اجرت سے زر نقد کی وہ مقدار مراد ہے جو بطور معاوضہ محنت کے ادا کی جائے مگر حقیقی اجرت سے مراد ان ضروریات زندگی یا دیگر اشیاء تن آسانی وغیرہ کی ہے جو اس زر نقد کی وساطت سے دستکار کو میسر ہو سکیں ممکن ہے کہ مختلف ممالک اور دستکاری کی مختلف شاخوں میں ظاہری اجرت کے مقادیر مساوی ہوں اور حقیقی اجرت کے مقادیر مندرجہ ذیل اسباب کے عمل سے مختلف ہوں ۔

(۱) مختلف ممالک میں زر نقد کی قوت خرید مختلف ہوتی ہے ممکن ہے کہ ہمارے ملک میں ۴ کے ایک سیر چاول بکتے ہوں لیکن کسی اور ملک میں اس کے عوض ۲ سیر چاول مل سکتے ہوں لہذا اگر دونوں ملکوں میں کسی دستکار کی اجرت ۴ ر یومیہ ہو ۔ تو صاف ظاہر ہے کہ جس ملک میں ۴ ر کی قوت خرید زیادہ ہے وہاں کے دستکاروں کی حقیقی اجرت بھی زیادہ ہے اگرچہ ظاہری اجرت کی مقداریں دونوں ملکوں میں مساوی ہیں ۔

(ب) مختلف ممالک میں ادائگی اجرت کی مختلف صورتیں ہیں بعض مقامات میں دستکار کے مکان کا کرایہ اس کی خور و نوش کی چیزیں یا مرغزار میں مویشی چرانے یا ایندھن کی کوئی خاص مقدار لے لینے کا حق بھی اس کی ظاہری اجرت پر اضافہ ہوتا ہے اسواسطے ممکن ہے کہ دو ملکوں میں کسی خاص قسم کے پیشہ ورول کی ظاہری اجرت مساوی ہو۔ لیکن ان کی ادائگی اجرت کے مختلف دستور مروج ہونے کی وجہ سے ایک میں حقیقی اجرت کی مقدار زیادہ ہو اور دوسرے میں کم۔ اکثر مغربی ممالک میں خاص خاص پیشہ ورول کو حق اجرت کے علاوہ بعض دیگر حقوق بھی حاصل ہیں جنکو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے خصوصًا جبکہ مختلف ممالک کی مقادیر اجرت کا مقابلہ کرنا مقصود ہو۔

(ج) بعض پیشوں میں دستکار کی بی بی اور اس کے بال بچوں کو بھی ہاتھ بٹانے کا موقع مل جاتا ہے بلکہ اکثر صورتوں میں بی بی کی کمائی میاں کے مساوی ہوجاتی ہے مثلاً بافندگی میں ایسا ہوسکتا ہے لیکن بڑھئی اور کسان کا پیشہ اس قسم کا ہے کہ بی بی بال بچے ان کے کام میں حصہ نہیں لے سکتے۔

(د) بعض پیشے قدرتًا اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان میں دستکار اپنے کام کو بالتواتر جاری نہیں رکھ سکتا لہذا ان پیشوں میں دیگر پیشوں کی طرح ایسا نہیں ہوتا کہ دستکار کو بالترتیب روزمرہ محنت کرنی پڑے۔ اس عدم تواتر کے کئی وجوہ ہیں۔

(۱) خاص خاص پیشوں کی قدرتی ضروریات۔

(۲) موسم کا اثر۔

(۳) بعض تمدنی اسباب۔

(۴) بعض اسباب جو خود دستکاروں کی طرزِ عمل سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً جب وہ کارخانہ داروں سے زیادہ اجرت لینے کی خاطر کاروبار چھوڑ دیتے ہیں اور کئی کئی دنوں تک بیکار بیٹھے رہتے ہیں۔ فن زراعت میں اجرت کی شرح مختلف موسموں میں مختلف ہوتی ہے بسا اوقات سال کی تیسری سہ ماہی میں پہلی ہی کی نسبت اجرت کی شرح اول دو اسباب کے عمل سے دگنی ہو جاتی ہے۔ مگر اس اختلاف کا باعث صرف موسموں کا تغیر ہی نہیں ہے۔ بلکہ فن زراعت کی قدرتی ضروریات بھی کچھ ایسی ہی واقع ہوئی ہیں مثلاً یہ پیشہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ کسان بیج بونے کے بعد اس کے اُگنے تک انتظار کریں علے ہذا القیاس بعض پیشوں میں اختلافِ اُجرت صرف اختلاف موسم کا نتیجہ ہوتا ہے مثلاً اینٹیں بنانا اور مکانوں پر نقش و نگار کرنا ایسے کام ہیں کہ ان کی ضرورت ہر روز اور ہر موسم میں نہیں پڑتی ان تمدنی اسباب میں جو مختلف ممالک میں پیشوں کی تواتر محنت پر اپنا اثر کرتے ہیں ایک یہ بھی ہے کہ بعض ممالک میں بعض تیوہار اور مذہبی رسومات کئی کئی دن تک رہتے ہیں بلکہ اکثر ممالک میں تیوہار کی تعداد سال میں سو دن سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ پس یہ تمام اسباب مختلف ممالک اور مختلف پیشوں میں دستکاری کی حقیقی اجرت میں اختلاف پیدا کرتے ہیں خواہ ان کی ظاہری اجرت کی شرح مساوی ہی کیوں نہ ہو۔

(۵) بعض ممالک اور بعض پیشوں میں دستکار بہ نسبت دیگر ممالک اور دیگر پیشوں کے زیادہ عمر تک زندہ رہتے ہیں صاف ظاہر ہے کہ اگر دو دستکار ایک ہی عمر میں اور ظاہری اجرت کی ایک ہی مقدار کے عوض میں باقاعدہ طور پر محنت کرنا شروع کریں تو وہ دستکار جو زیادہ عمر تک زندہ رہیگا حقیقی اجرت

کی زیادہ مقدار تیار کریگا۔

(۲) دوسرا امتیاز جس کا ذہن نشین کرنا لازم ہے۔ اجرت یا ظاہری مصارف محنت اور حقیقی مصارف محنت کے درمیان ہے ظاہری مصارف محنت سے مراد اجرت کی وہ مقدار ہے جو کارخانہ داروں کو ادا کرنی پڑتی ہے اور اس کی کمی بیشی ضروریات زندگی یا اشیاء تن آسانی وغیرہ کی اس مقدار کی کمی بیشی پر منحصر ہے جو دستکار کو اپنی اجرت کے عوض میں میسر ہو سکے لیکن حقیقی مصارف محنت کی مقدار اس معاوضے کی مقدار پر منحصر ہے جو کارخانہ داروں کو دستکاروں کے کام پر لگانے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ ادائگی اجرت کے عوض میں ملتی ہے خواہ ظاہری مصارف محنت یا اجرت کی مقدار جو وہ اپنے دستکاروں کو ادا کرتا ہے کم ہو یا زیادہ۔

ممکن ہے کہ کارخانہ دار کو ظاہری مصارف محنت یا اجرت کی ایک بہت بڑی مقدار ادا کرنی پڑے مگر حقیقی مصارف محنت دستکار کی ہنرمندی اور اس کی محنت کی کارکردگی وغیرہ کی وجہ سے کم ہوں۔ برخلاف اس کے یہ بھی ممکن ہے کہ کارخانہ دار اجرت کی ایک ایسی قلیل مقدار ادا کرے جو بمشکل دستکاروں کے گذارہ کے لئے کافی ہو۔ مگر سستی غفلت بے ہنری اور بھدا کام کرنے کے باعث ان کی تیار کردہ اشیاء کی فروخت سے اجرت کی وہ مقدار بھی کارخانہ دار کے پلے نہ پڑے۔ جو اس نے ادا کی ہے۔ کاری گر کفش دوز جو زیادہ اجرت لیتا ہے چمڑے کی کفایت اس ذکاوت سے کرتا ہے کہ ایک گز کے چار جوڑے بوٹ بنا لیتا ہے۔ مگر بے ہنر کفش دوز اسی قدر چمڑے کے تین جوڑے بھی مشکل سے بنا سکتا ہے لہٰذا متقدم الذکر کو کام پر لگانے سے کارخانہ دار کو منافع ہوگا اور موخر الذکر کو کام پر لگانے سے نقصان۔ یا یوں کہو کہ پہلی صورت میں کارخانہ دار کی حقیقی مصارف محنت کم ہونگے اور دوسری صورت میں زیادہ۔ فرض کرو کہ

دو کفش دوز ہیں جن میں سے ایک کی یومیہ اجرت عـہ ہے مگر پہلے کا بنایا ہوا بوٹ جس پر لاگت عـہ آتی ہے اس کی کاری گری کی وجہ سے للعہ قیمت پاتا ہے اور دوسرے کا بنایا ہوا بوٹ جس پر اس کے کم درجہ کا کاری گر ہونے کی وجہ سے عـہ لاگت آتی ہے تین روپیہ قیمت پاتا ہے صاف ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں عـہ اجرت ادا کرنے کا معاوضہ دستکار کی عمدہ کام کرنے کے باعث صرف ۱۲؍ ہے ظاہری مصارف محنت دونوں صورتوں میں مساوی ہیں تاہم پہلی صورت میں دستکار کی ہنرمندی کی وجہ سے حقیقی مصارف کم ہیں اور دوسری صورت میں دستکار کے کم درجہ کا کاری گر ہونے کے باعث زیادہ ہیں کیونکہ پہلی صورت میں عـہ اجرت دینے کا معاوضہ عا ملتا ہے اور دوسری صورت میں صرف ۱۳؍ غالباً یہ صحیح ہے کہ زیادہ سے زیادہ اجرت پانیوالے دستکار وہی ہوتے ہیں جنکی محنت سے کارخانہ دار کو حقیقی مصارف محنت کی کم سے کم مقدار ادا کرنی پڑے اسکا ثبوت یہ ہے کہ جب کارخانہ دار اپنے دستکاروں کی تعداد کو کم کرنا چاہتے ہیں تو وہ پہلے بالعموم انہیں دستکاروں کو چھٹی دیتے ہیں جنکی اجرت سب سے کم ہو۔ کیونکہ ان کی محنت سے حقیقی مصارف محنت کی مقدار بڑھتی ہے اس کے علاوہ جن قوموں میں حقیقی اجرت کی شرح نہایت قلیل ہوتی ہے۔ بالعموم وہی قومیں اس بات پر مجبور رہتی ہیں کہ دیگر ممالک کی تیار شدہ اشیاء پر جہاں اجرت کی مقدار بہت زیادہ ہے اس قدر محصول لگاویں کہ وہ ان کے ملک میں بک نہ سکیں۔ ہندوستان میں روئی کاتنے والی کی اجرت بوجہ اس کے بھدا کام کرنے کے عـہ فی ہفتہ ہے مگر انگلستان میں ایسے دستکار کی اجرت بوجہ اس کی تیزی کے فی ہفتہ پندرہ روپیہ ہے اسواسطے موخر الذکر ملک میں مقدار اجرت کے زیادہ ہونے کے باعث حقیقی مصارف محنت کی مقدار بہت کم ہے جس کے یہ نتیجہ

ہیں کہ وہاں کے کارخانہ دار اپنی تیار کردہ اشیاء کو دیگر ممالک میں کم قیمت پر بیچکر بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انگلستانی کپڑے کی کثیر مقدار آتے رہنے کے باعث ہمارے دیسی کپڑے کی تجارت معدوم ہوگئی ہے کیونکہ ہمارے ملک میں بسبب کمی اجرت کے حقیقی مصارف محنت کی مقدار بہت زیادہ ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ ہمارے کارخانہ دار انگریزی کارخانداروں کی طرح کم قیمت پر کپڑا بیچکر فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اسواسطے مجبوراً تجارت کی اس شاخ کو ہی چھوڑ بیٹھے ہیں لہٰذا ہندوستان کی موجودہ اقتصادی حالت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انگلستان کے کپڑے پر محصول لگایا جاوے تاکہ ہمارے ملک کی اپنی صنعت کو ترقی ہو انگلستان کا کپڑا نفیس بھی ہوتا ہے اور سستا بھی اس واسطے یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ایسے کپڑے کے سامنے ہندوستان میں کپڑے کی صنعت چمک سکے جہاں کے دستکار بمشکل کام کرنے والے ہیں اور جہاں کے کارخانداروں کو حقیقی مصارف محنت کی زیادہ سے زیادہ مقدار ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس توضیح کے بعد ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مقدار اجرت کی کمی بیشی کس بات پر منحصر ہے اکثر انگریزی محققین اس بات پر متفق ہیں کہ کل سرمائے کا کچھ حصہ ادائگی اجرت کے لئے علیحدہ نکال کر رکھ لیا جاتا ہے جس کی مقدار ہر ملک میں اقتصادی اسباب کے عمل سے قدرتاً معین ہو جاتی ہے سرمائے کی یہ معین مقدار سرمایۂ اجرت کہلاتی ہے اور مختلف دستکاروں پر مقابلے کے اثر سے منقسم ہوتی ہے۔ اگر ایک دستکار کو زیادہ اجرت ملتی ہے تو ضرور ہے کہ دوسرے کو کم ملے اور اسواسطے ہر دستکار کی اجرت بحساب اوسط سرمایۂ اجرت کی مقدار اور تعداد دستکاران کی درمیانی نسبت سے متعین ہوتی ہے یعنی اگر سرمایۂ اجرت کی مقدار زیادہ ہے اور دستکاروں کی تعداد کم تو دستکاروں کو زیادہ اجرت

بڑھیگی اور اگر سرمایۂ اجرت کی مقدار کم ہے اور دستکاروں کی تعداد زیادہ تو ان کی اجرت کم ہوگی پس ان حکماء کے نزدیک سرمایۂ اجرت کی مقدار دستکاروں کی تعداد سے بالکل متاثر نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ایک ایسی مقدار ہے جو اقتصادی اسباب کے عمل سے ہر ملک میں خود بخود معین ہو جاتی ہے اور یہ کوئی ضرور نہیں کہ اگر کسی ملک میں دستکاروں کی تعداد بڑھ گئی ہے تو سرمایۂ اجرت کی مقدار بھی بڑھ جائیگی۔ غرض کہ یہ حکماء لگان اور اجرت کو نکال کر پیداوار دولت کے باقی حصہ کو اس شخص کا حق قرار دیتے ہیں جو ساہوکار بھی ہو اور کارخانہ دار بھی۔

مگر امریکہ کے مشہور محقق واکر اس مسئلہ کی نہایت زور سے تردید کرتے ہیں اور انگریزی محققین کی تحریروں پر حسب ذیل اعتراض کرتے ہیں۔

(۱) یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اجرت ہر حالت میں سرمائے کی مقدار میں سے ادا کی جائے جو کارخانہ دار کے پاس پہلے سے جمع ہو۔ انگریزی محققین کا یہ مسئلہ صرف انگلستان کے حالات اقتصادی کے مشاہدے کا نتیجہ ہے جہاں سرمائے کی بہت سی مقدار پہلے سے جمع تھی اور جہاں دستکاروں کی اجرت گذشتہ سالوں میں اس قدر خفیف رہی ہے کہ ان کو روزمرہ کے ضروریات زندگی کے لئے مجبوراً اپنے کارخانہ دار کا منہ تکنا پڑتا تھا کیونکہ وہ بسبب کم حیثیت ہونے کے اپنی تیار کردہ اشیاء کی فروخت تک انتظار نہ کر سکتے تھے۔ صوبجات متحدہ امریکہ میں چونکہ دستکاروں کی مالی حالت اچھی ہے اسواسطے کارخانہ دار اشیاء کی فروخت کے بعد اجرت ادا کرتے ہیں اگرچہ وہاں کے دستکار اپنی اپنی ضرورت کے مطابق فروخت اشیاء سے پہلے بھی اپنی اجرت کا کچھ حصہ لے سکتے ہیں۔

(۲) اگر کارخانہ دار اپنے دستکاروں کو روزانہ اجرت دے بھی دیا کریں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اجرت کی مقدار سرمایۂ اجرت کی مقدار سے معین

ہوتی ہے کیونکہ کارخانہ دار اپنا موجودہ سرمایہ خرچ کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ مزید دولت پیدا کرنے کی غرض سے لگاتا ہے جس سے اس کو منافع کی توقع ہوتی ہے یہ دولت جو دستکاروں کی محنت سے پیدا ہوتی ہے زیادہ ہو تو کارخانہ دار ان کو اجرت بھی زیادہ ادا کر سکے گا اور اگر اس کی مقدار کم ہو تو وہ اپنے نفع کے خیال سے اجرت بھی کم ادا کر سکیگا۔ لہذا اجرت کی مقدار دستکاروں کی پیداوار محنت کی قدر پر منحصر ہے جس قدر اس کی پیداوار محنت کی قدر زیادہ ہوگی یا یوں کہو کہ جس قدر دستکار اپنی محنت کی کارکردگی اور ہنرمندی کی وجہ سے مزید دولت پیدا کریگا اسی قدر اس کی اجرت بھی زیادہ ہوگی پس اجرت حقیقت میں دستکار کی پیداوار محنت میں سے ادا کی جاتی ہے نہ سرمایہ اجرت میں سے جو کارخانہ دار کے پاس موجود ہو۔

(۳) چونکہ دلیل مندرجہ بالا کے مطابق اجرت کی مقدار دستکاروں کی پیداوار محنت کی مقدار سے متعین ہوتی ہے اسواسطے ظاہر ہے کہ اگر پیداوار محنت کی مقدار زیادہ ہوگی تو دستکاروں کی اجرت بھی زیادہ ہوگی اور اگر اس کی مقدار کم ہوگی تو اجرت بھی کم ہوگی لہذا اجرت کی مقدار دستکاروں کی تعداد کے ساتھ ایک ضروری تعلق رکھتی ہے مثلاً اگر زرعی دستکاروں کی تعداد بڑھ جاوے اور زمین کی کاشت ابھی نقطۂ تقلیل تک نہ پہنچی ہو۔ تو صاف ظاہر ہے کہ انقسام محنت کی وجہ سے پیداوار محنت کی مقدار بہت زیادہ ہو جاوے گی۔ یہ کوئی ضرور نہیں کہ پیداوار محنت کی مقدار میں اسی نسبت سے زیادتی ہو جس نسبت سے کہ دستکاروں کی تعداد میں زیادتی ہوتی ہے۔ بلکہ جب زمین کی کاشت نقطۂ تقلیل تک نہ پہنچی ہو۔ تو دستکاروں کی تعداد میں زیادتی ہو جانے کے باعث انقسام محنت زیادہ بکمی شروع ہو کر جاتا ہے یعنی پیداوار محنت کی

مقدار اس نسبت سے بہت زیادہ ہوسکتی ہے) اس صورت میں چونکہ پیداوارِ محنت کی مقدار بڑھ گئی ہے اسواسطے ممکن ہے کہ دستکاروں کی اجرت بھی بڑھے اور سرمایہ کی مقدار میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ علےٰ ہذا القیاس اگر زمین کی کاشت نقطۂ تقلیل تک پہنچ گئی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ دستکاروں کی زیادتی سے پیداوارِ محنت فی کس کم ہوجائیگی لہٰذا اجرت فی دستکار بھی کم ہوگی خواہ سرمائے کی مقدار میں زیادتی ہی کیوں نہ ہو۔

مندرجہ بالا وجوہ سے محقق موصوف انگریزی حکما کی رائے کو تسلیم نہیں کرتا اور اس بات پر بار بار زور دیتا ہے کہ ان کے خیال کو صحیح سمجھنا اور یہ تسلیم کرلینا کہ دستکاروں کی اجرت سرمایۂ اجرت میں سے ادا کی جاتی ہے گویا اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ دستکاروں کا ہنرمندی دیانت داری اور دیگر اوصاف میں ترقی کرنا اگرچہ ان کی پیداوارِ محنت کو زیادہ کرتا ہے تاہم انکی ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ ان کی اجرت سرمائے کی ایک معین مقدار سے ادا کی جاتی ہے اور اجرت کی کمی بیشی اس مقدار کی کمی بیشی پر انحصار رکھتی ہے انگریزی حکما یہ سمجھتے ہیں کہ پیداوارِ دولت میں لگان اور اجرت کو نکال کر باقی جو کچھ بچتا ہے وہ اس شخص کا حق ہے جو ساہوکار بھی ہو۔ اور کارخانہ دار بھی مگر محقق واکر کے نزدیک اجرت کی بحث لگان سود اور منافع کی بحث کے بعد آتی ہے۔ کیونکہ اجرت پیداوارِ دولت کی اس مقدار کے برابر ہے جو تینوں مذکورہ حصوں کو نکال کر باقی بچے۔ لگان کی کمی بیشی اشیاء کی قیمتوں پر کوئی اثر نہیں کرتی اور نہ لگان کی مقدار دستکاروں کی اجرت میں سے نکالی جاتی ہے اسواسطے دستکار زمین کے کسی حصے کا حق دار نہیں ہے۔ علےٰ ہذا القیاس سود چونکہ استعمالِ سرمایہ کا معاوضہ ہے اور اس کی کمی بیشی ان لوگوں پر

اثر کرتی ہے جو دولت کے جمع کرنے والے ہوں لہذا دستکار کو بحیثیت دستکار ہونے کے شرح سود سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ منافع بھی لگان کی طرح اشیاء کی قیمتوں پر کوئی اثر نہیں کرتا اور نہ اس کی مقدار دستکاروں کی اجرت میں سے نکالی جاتی ہے لہذا یہ تینوں حصے لگان سود اور منافع دستکاروں کی اجرت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتے اور یہ ضروری ہے کہ اجرت دستکاراں کا اندازہ لگانے کے لئے پیداوارِ دولت کی کل مقدار میں سے پہلے ان کو وضع کر لیا جائے اگر اشیاء کی قیمتوں پر ان کا اثر ہوتا تو صاف ظاہر ہے کہ دستکار کی اجرت بھی ان سے متاثر ہوتی کیونکہ حقیقی اجرت سے مراد ان ضروریات زندگی یا دیگر اشیاء سے ہے جنکو دستکار زر نقد کی وساطت سے خرید کر سکیں مگر چونکہ اجرت پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا اس واسطے محقق مذکور کے نزدیک تینوں حصول یعنی لگان سود اور منافع کو نکال کر دولت کی پیداوار میں سے جو کچھ باقی بچے وہ دستکار کا حق ہے کیونکہ ہر سبب جو پیداوار محنت کی مقدار کو زیادہ کرتا ہے حقیقت میں دستکار کے حصے کو زیادہ کرتا ہے تم شاید کہو گے کہ پیداوار محنت کی زیادتی سے زمیندار ساہوکار اور کارخانہ دار کا حصہ کیوں نہیں بڑھتا۔ اِس سوال کے جواب کے لئے فرض کرو کہ دستکار اپنے کام میں نسبتاً زیادہ چست اور کاریگر ہو گئے ہیں جس سے پیداوار محنت کی مقدار بھی زیادہ ہو گئی ہے اور وہ مصالح بھی کم خرچ ہوتا ہے جس سے اشیاء تجارتی تیار ہوتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ پیداوار محنت کی یہ زیادتی کس کا حق ہے۔؟ زمیندار کا؟۔ نہیں ہرگز نہیں۔ کیونکہ اِس مصالح میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ جس کو زمین سے نکال کر اشیاء تجارتی کی تیاری میں صرف کیا جاتا تھا اس کی مقدار وہی ہے،

جو پہلے صرف ہوا کرتی تھی بلکہ دستکاروں کی کفایت شعاری کی وجہ سے نسبتاً کم ہوگئی ہے لہذا مصالح مذکور کی مانگ میں کوئی تغیر نہ آنے کی وجہ سے ادنے درجہ کی زمینوں کو کاشت میں نہیں لانا پڑتا جس سے لگان یعنی زمیندار کے حصے کی مقدار میں اضافہ ہوجائے۔ علےٰ ہذا القیاس یہ زیادتی ساہوکار کا بھی حق نہیں ہے کیونکہ سرمایہ کی مانگ بدستور وہی ہے جو پہلے تھی کوئی وجہ نہیں کہ شرح سود یعنی ساہوکار کا حصہ نسبتاً بڑھ جائے جب کہ سرمائے کی مانگ میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ بلکہ دستکاروں کا کاری گری میں ترقی کرنا ساہوکار کے حصے کو الٹا کم کرتا ہے کیونکہ کاری گر دستکار کو بالعموم اشیاء تجارت کی تیاری کے لئے اس قدر اوزاروں کی ضرورت نہیں ہوتی جس قدر کہ بھدا کام کرنے والے بنے دستکار کو۔ کاری گر تھوڑے اوزاروں کی مدد سے بھی اپنا کام بخوبی کرسکتا ہے لہذا وہ مجموعی طور پر سرمائے کی مانگ کو کم کرتا ہے یا بالفاظ دیگر شرح سود کو کم کرتا ہے کیونکہ وہ اس مقدار کو استعمال میں لائے جانے سے بچاتا ہے جو بصورت دیگر اوزاروں کے بنانے میں صرف کرنی پڑتی۔ اسی استدلال کی بنا پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پیداوار محنت کی یہ زیادتی کارخانہ دار کا حق بھی نہیں ہے کیونکہ کارخانہ دار کا حصہ یا منافع صرف اسی صورت میں زیادہ ہوسکتا ہے جبکہ کارخانہ داروں کی تعداد میں زیادتی ہو (یہ بات پہلے ثابت ہو چکی ہے) اور یہ کوئی ضرور نہیں کہ دستکاروں کا کاری گری میں ترقی کرنا کارخانہ داروں کی زیادتی تعداد کا مستلزم ہو۔ بلکہ دستکاروں کے ہنر اور کاری گری میں ترقی کرنے سے لیاقت انتظامی کا معیار بڑھ جاتا ہے جس سے ناقابل کارخانہ داروں کا وجود معطل ہوجاتا ہے اور وہ دائرۂ تجارت سے روز بروز خارج ہوتے جانے کا میلان رکھتے ہیں جس کے یہ معنے ہیں کہ کارخانہ دارونکی

تعداد کم ہو جانے کے باعث ہشیار اور قابل کارخانداروں کا منافع کم ہو جاتا ہے
لہٰذا ثابت ہوا کہ پیداوار محنت کی زیادتی جو دستکاروں کی ذاتی ترقی سے
پیدا ہوتی ہے خود دستکاروں کا حق ہے۔ زمینداروں ساہوکاروں اور
کارخانہ داروں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

باب پنجم

مقابلۂ ناکامل دستکاروں کی حالت پر کیا اثر کرتا ہے۔

اگرچہ موجودہ تمدن میں دستکار نظری لحاظ سے پیداوار دولت کے بہ تمام مقدار کا مالک ہے جو زمیندار ساہوکار اور کارخانہ دار کا حصہ نکال کر باقی رہتی ہے تاہم بعض اسباب کے عمل سے دستکاروں کو انتہا درجے کا نقصان پہنچ جاتا ہے اور وہ اپنا پورا حصہ حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں۔

(۱) بسا اوقات دستکاروں میں شادیوں کی تعداد اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ چند سالوں میں ان کی آبادی دگنی ہو جاتی ہے۔ جس سے پیداوار محنت کی مقدار فی کس کم ہو جاتی ہے کیونکہ افزائش آبادی کے باعث روز بروز ادنے درجے کی زمینوں کو مجبوراً کاشت میں لانا پڑتا ہے فرضاً اگر پہلے بیس دستکاروں کی پیداوار محنت چالیس من غلہ ہو۔ تو ان کا حصہ فی کس دو من ہوگا۔ لیکن اگر دستکاروں کی تعداد چالیس ہو جاوے تو صاف ظاہر ہے کہ ان کا حصہ فی کس صرف ایک من رہ جائیگا۔

(۲) علی ہذا القیاس اصول مقابلہ کے کامل طور پر عمل نہ کرنے کے باعث بھی دستکار نقصان اٹھاتے ہیں۔ بالعموم دستکار نقل مکان کی تکلیف

گوارا کرکے ایسے مقامات میں جانا نہیں پسند کرتے جہاں شرحِ اجرت کی مقدار زیادہ ہو۔ بلکہ جس جگہ حالات نے ایک جگہ لاپھینکا وہیں پڑے رہتے ہیں ایک مصنف لکھتا ہے کہ تمام اشیاء نقلِ مکان کر سکتی ہیں مگر انسان ایک ایسی چیز ہے کہ بڑی مشکل سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک حرکت کرتا ہے۔ البتہ بعض ممالک میں جہاں کے لوگ قدرتاً چست اور اپنی حالت کو سنوارنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ دستکار آزادی سے نقلِ مکان کرتے ہیں جس سے مختلف جگہوں اور مقاموں کے دستکاروں کے درمیان اصولِ مقابلہ پورے طور پر عمل کرتا ہے اور اجرت کے مقادیر میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوسکتا۔ علاوہ بریں دستکار اپنے پیشوں کو تبدیل کرنے سے بھی بالعموم گھبراتے ہیں اس غفلت یا کاہلی کی وجہ سے انہیں بسا اوقات ایسے پیشوں میں روزگار تلاش کرنا پڑتا ہے جہاں دستکاروں کی بہتات ہو۔ دستکاروں کی غلطی کے اور اسباب کے علاوہ ایک یہ بھی ہے کہ تبدیلِ پیشہ ایک قسم کا طعن تصور کیا جاتا ہے اگر کسی درزی سے کہو کہ اپنے بیٹے کو کفش دوزی یا آہن گری کا کام سکھلائے کیونکہ اس کام میں بوجہ قلتِ افرادِ دستکاروں کی اجرت کی مقدار زیادہ ہے تو اس بات سے وہ گھبراتا ہے اور آہن گری یا کفش دوزی کو اپنی ذات کے خلاف سمجھتا ہے مگر مقامِ شکر ہے کہ انگریزی تعلیم کے اثر سے یہ تمدنی نقص اب روز بروز دور ہو رہا ہے۔

اگر مقابلہ ہر طرح سے کامل ہو۔ اور پورے طور پر اپنا عمل کر رہا ہو تو صاف ظاہر ہے کہ اس کے اثر سے ہر دستکار اپنے ہنر کے مطابق اجرت پائیگا۔ جو شخص جس کام کی قابلیت قدرتاً رکھتا ہوگا۔ وہی کام اس سے لیا جائیگا اور نظامِ تمدن میں ہر فرد کے فرائض وہی ہونگے جو ہونے چاہئیں۔ دستکاروں کی حالت میں ایک قسم کی مساوات قائم ہوجائیگی اور وہ تمام نقصان جو مقابلہ

ناکامل کی صورت میں دستکاروں کو پہنچتے تھے دور ہوجائینگے۔ ہم پہلے اشارۃً بیان کر آئے ہیں کہ مقابلہ سے مراد اس تجارتی رقابت کی ہے جو انسان کی فطری خودغرضی کی وجہ سے کسی شے کے خریدنے اور بیچنے والوں کے درمیان پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ بات ناگوار سی معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کشش ثقل کی وجہ سے اجرام فلکی کے درمیان ایک قسم کا نظام قائم ہے اسی طرح مقابلہ بھی ایک قسم کی کشش ہے جس کے عمل سے صنعت و حرفت کے عالم میں نظام قائم ہوجاتا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مقابلہ کے اثر سے ہر دستکار تجارت کی اسی شاخ پر کام کریگا جہاں اسے اجرت کی زیادہ سے زیادہ مقدار ملتی ہے تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اسکا فائدہ صرف اس کی ذات تک محدود ہے بلکہ اگر دوسرے پہلو سے دیکھو تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ مقابلہ کے اثر سے ہر دستکار تجارت کی اس شاخ میں پہنچ جائیگا جہاں اس کی ضرورت زیادہ ہے اگر تجارت کی کسی ایک شاخ میں کام کرنے سے کسی دستکار کی تیار کردہ شے بہ نسبت دیگر شاخوں کے زیادہ قیمت پاتی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ تجارت کی اس خاص شاخ میں بہ نسبت دیگر شاخوں کے اس دستکار کی مانگ زیادہ ہے اگر وہ اس شاخ کو چھوڑ کر کسی اور شاخ میں چلا جاوے تو نہ صرف نقصان اٹھائیگا۔ بلکہ اس کی حرکت سے اوروں کو بھی نقصان پہنچیگا۔ علاوہ بریں مقابلہ کامل کے عمل سے قدرتی اور دیگر حوادث (مثلاً قومی سرمایہ کا عظیم الشان جنگوں میں صرف ہوجانا فصل نہ ہونا۔ آتش زدگی طوفان وغیرہ) کا اثر دستکاروں پر مساوی طور پر منقسم ہوتا ہے جس کے معنی ہیں کہ مقابلہ کامل دستکار کا محافظ ہے اور ان کو بحیثیت مجموعی اس بربادی اور تباہی سے بچاتا ہے جو اس قسم کے حوادث کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔

مثلاً فرض کرو کہ تم جو کے ایک ڈھیر پر زور سے ایک پتھر مارتے ہو۔ ظاہر ہے کہ تم اس صدمہ سے جو کے ایک منفرد دانے کو بھی نہیں کچل سکتے کیونکہ دانے ادہر اُدہر ہو جائینگے اور پتھر ڈھیر کے اندر گھس جائیگا برخلاف اس کے اگر تم ڈھیر میں سے ایک جو کو لیکر اس کے اوپر پتھر مارو۔ تو یہ دانہ ریزہ ریزہ ہو جائیگا۔ یہی حال دستکاروں کا ہے اگر ڈھیر کے دانوں کی طرح ان کی حرکت بھی آزاد نہ ہو اور یہ ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک پیشہ سے دوسرے پیشہ میں بلا قید منتقل ہو سکتے ہوں تو حوادث کا اثر چونکہ سب پر مساوی تقسیم ہو جائیگا۔ اس واسطے کسی فرد واحد کو چنداں محسوس نہ ہوگا۔ اور سب کے سب افراد محفوظ رہینگے اور مزید براں ایسے اسباب فی الفور اپنا عمل شروع کر دینگے جنکے اثر سے وہ کمی پوری ہو جائیگی جو ان ناگہانی حوادث سے پیدا ہوئی ہو غرض کہ مقابلہ کامل اور دیگر اقتصادی اسباب کا عمل دستکاروں کی تمدنی حیثیات کے درمیان ایک قسم کی ایسی مساوات اور ایک طرح کی ایسی یگانگت ہم آہنگی اور اتحاد پیدا کرنے کی طرف میلان رکھتا ہے جس کے ساتھ تجارت کی ہر شاخ کی ترقی اور توسیع وابستہ ہے۔

لیکن چونکہ نفس الامر میں ایک قسم کا کامل مقابلہ کسی ملک کے دستکاروں کے درمیان نہیں ہے اس واسطے نظام تمدن کی موجودہ صورت میں دستکاروں کی حالت بالعموم اچھی نہیں ہے موجودہ ناکامل حالت اس امر کی مقتضی ہے کہ اقتصادی اسباب کا اثر دستکاروں کا مؤید نہو۔ بلکہ مخالف ہو۔ جو مصیبت کا مارا زندگی کی دوڑ میں ایک دفعہ منہ کے بل گر گیا وہ پھر اٹھ نہیں سکتا اور موجودہ حالت میں ایسے اسباب کبھی موجود نہیں جنکا عمل اس بدقسمت کو سہارا دیکر اپنے پاؤں پر کھڑا کردے جب کوئی دستکار

بے روزگار ہو کر مفلس ہو جاتا ہے تو بالعموم وہ فطری خودداری اور ہم چشموں کی نگاہوں میں وقعت پیدا کرنے کی آرزو اس پر کوئی اثر نہیں کر سکتی جو قدرتاً انسان کو اوروں سے آگے بڑھ جانے کی ایک زبردست تحریک دیتی ہے مفلسی کا آزار انسان کی روحانی قوائے کا دشمن ہے۔ اور وہ مایوسی تفکر اور غفلت شعاری کاہلی اور فلاکت کی اور صورتیں جو اس بلائے بے درمان کے ساتھ آتی ہیں دستکار کی ذاتی قابلیت اور اس کی محنت کی کارکردگی پر ایسا برا اثر کرتی ہیں کہ اس کے کام کی وہ کیفیت اور کمیت نہیں رہتی جو پہلے ہوا کرتی تھی ایک دفعہ کی شکست بیچارے دستکار کو ہمیشہ کے لئے کارزار زندگی کے ناقابل کر دیتی ہے اور پھر یہ نہیں کہ اس شکست کا کچھ علاج ہو جائے بلکہ جدید اقتصادی اسباب کا عمل (مثلاً تجارت کی توسیع محنت کی نئی شاخوں کا کھلنا اور ملک کی روز افزوں اقبال مندی) اس بیچارے کی حالت کو سدھار نہیں سکتا۔ لہٰذا موجودہ مقابلہ ناکامل کی صورت میں اقتصادی اسباب کا عمل اس طرف میلان رکھتا ہے کہ نظامِ صنعت میں افراد کا موجودہ اختلافِ مدارج روز بروز بڑھتا جائے اور جس فرد یا جماعت کو کسی سبب سے آغاز ہی میں کوئی مصیبت دامن گیر ہو گئی اس کی حالت بدستور وہی رہے بلکہ روز بروز ابتر ہوتی جائے۔ تمدن کی ایسی حالت میں ایک نہایت ضروری سوال پیدا ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر نظامِ صنعت مقابلۂ کامل کی برکات سے خالی ہو۔ تو اجرت کی مقدار کو بڑھانے اور دستکار کی تمدنی حالت کو سنوارنے کے واسطے کیا وسائل اختیار کرنے چاہئیے۔

حکما کا ایک طبقہ جس کو حکمائے متوکلین کے نام سے موسوم کرنا چاہئیے کہتا ہے کہ موجودہ نظامِ صنعت میں قوانین وغیرہ کی مدد سے کوئی دست اندازی

نہیں کرنی چاہئے بلکہ اسکو تمام قانونی اور دیگر قیود سے آزاد کرکے اس بات پر اعتماد کرنا چاہئے کہ بالآخر جو کچھ ہوگا نوعِ انسان کے لئے اچھا ہوگا - یہ حکماء اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ قانون کی مدد سے دستکاروں کی اجرت کا زیادہ کرنا بُرے نتائج پیدا کرتا ہے مثلاً فرض کرو کہ کسی ملک کے ارکانِ سلطنت نے یہ قانون وضع کیا ہے کہ اجرت کی مقدار بیس فی صدی کے حساب سے زیادہ کردینی چاہئے اگر پیداوار محنت کی مقدار میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی تو صاف ظاہر ہے کہ کارخانہ داروں کو نقصان پہنچیگا - اور وہ اپنا سرمایہ دیگر ممالک میں لگاوینگے جہاں اس قسم کا کوئی قانون مروج نہیں ہے - علیٰ ہٰذاالقیاس اگر سرکار یہ قانون وضع کردے کہ ہر دستکار آٹھ گھنٹہ یومیہ سے زیادہ کام نہ کریگا تو یہ ایک صریح ناانصافی ہوگی کیونکہ بعض پیشوں میں آٹھ گھنٹہ کام کرنا کوئی بات نہیں مگر بعض پیشوں میں اتنے گھنٹہ یومیہ کام کرنا جسمانی صحت کے بالکل مخالف ہے بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہر بے روزگار دستکار کا حق ہے کہ سرکار اسے روزگار دے - بالفرض اگر ایسا ہو تو سرکار کو تنخواہ یا اجرت کی ادائگی کے واسطے رعایا سے قرض اٹھانا پڑیگا اور داخلِ ملکی میں کسی نہ کسی طرح زیادتی کرنی ہوگی - اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ عرصہ کے لئے یہ طریق عمل مفید ہوگا - مگر اس کو مستقل طور پر اختیار کرنا انتہا درجہ کا مضرت رساں ہے - کیونکہ آبادی کی روزافزوں ترقی کو کوئی نہیں روک سکتا - لہٰذا ان حکماء کے نزدیک تمام قانونی قیود محض بے سود ہیں - مگر یاد رکھنا چاہئے کہ حقیقی آزادی قیود کے دور کرنے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ بعض قیود ایسے ہوتے ہیں جن سے انسان کی آزادی کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہوجاتا ہے مثلاً اگر کسی تماشاگاہ میں آگ لگ جائے اور ہر شخص اپنے بچاؤ کے لئے وہاں سے

بھاگے تو صاف ظاہر ہے کہ دیوانہ وار اِدھر اُدھر بھاگنے کی نسبت اگر تماشائی کسی خاص ترتیب کے پابند ہو کر وہاں سے نکلیں تو یہ طریق عمل زیادہ محفوظ ہوگا علےٰ ہٰذاالقیاس ہر قسم کے انتقال زمین کے لئے ایک خاص تحریر اور پھر اس تحریر میں خاص خاص قانونی اصطلاحوں کا استعمال ضروری ہے جو بظاہر ایک قسم کی قید ہے مگر حقیقت میں آزادی انتقال کو زیادہ کرتی ہے کیونکہ اس قسم کی قیود سے انتقال کنندہ کو ہر طرح کا اطمینان ہو جاتا ہے اور کوئی کسی قسم کا شک وشبہ نہیں رہتا جس کا بصورتِ عدم تحریر وغیرہ اسکے دل میں پیدا ہونا ممکن تھا۔ لہٰذا دستکاروں کی حالت کو سنوارنے کا سب سے احسن طریق یہ ہے کہ دستکاروں اور کارخانہ داروں کے درمیان ہمدردی پیدا کی جائے اور یہ بات ان کے ذہن نشین کی جائے کہ قوم کی بہبودی تمام افراد کی بہبودی سے وابستہ ہے اور ایک رشتے کے ضعیف اور کمزور ہو جانے سے تمام قوم کا شیرازہ بگڑ جانے کا اندیشہ ہے بعض لوگوں کے نزدیک طریقِ معاونت پر عمل کرنا بھی دستکاروں کیلئے مفید ہے کیونکہ اس طریق سے وہ منافع جو کارخانداروں کی جیب میں جاتا ہے دستکاروں کے قبضے میں آتا ہے علےٰ ہٰذاالقیاس دیگر ممالک میں جاکر آباد ہونا بھی دستکاروں کی بہبودی پر ایک نمایاں اثر کرتا ہے کیونکہ اسکی وساطت سے کسی ایک ملک میں ان کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہمارے ملک میں سے قریباً بارہ لاکھ دستکار اس وقت جزائر میں آباد ہیں جہاں انکی حالت بہت اچھی ہے لیکن ابھی ہندوستان کے دستکاروں کو نقلِ مکان کی بہت ضرورت ہے مگر ہمارے نزدیک کمی اجرت کا مفید ترین نسخہ قومی تعلیم ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس سے دستکار کا ہنر اس کی محنت کو کارگر کر دیگی

اور اس کی ذہانت ترقی کرتی ہے اس کے اخلاق سنورتے ہیں اور وہ اس قابل بنتا ہے کہ اسپر اعتماد کیا جائے۔ تعلیم کی مدد سے دستکار اپنے کام کو سہولت کے ساتھ کر لینے کی راہیں سوچ سکتا ہے اور جدید کلوں کا استعمال جلد سیکھ سکتا ہے اور شراب خوری اور ہر قسم کی غلط کاری سے محفوظ رہتا ہے جو بالعموم جہالت اور ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

PRESEN...

باب ششم

سرکار کا حصہ یا مالگذاری

پیداوارِ دولت کی کچھ مقدار ایسی بھی ہے جو نہ زمیندار اور ساہوکار کے قبضے میں جاتی ہے نہ کارخانہ دار اور دستکار کے قبضے میں۔ یہ مقدار دو حصوں پر منقسم کی گئی ہے۔

(۱) اول وہ مقدار جو محصولات و مالگذاری کی صورت میں سرکاری خزانوں میں جاتی ہے۔ حکماء کے درمیان اس امر کے متعلق بڑا اختلاف ہے کہ آیا حصہ سرکار کی بحث تقسیم دولت کے باب میں آنی چاہئے یا صرف دولت کے باب میں کیا سرکار کو پیداوارِ دولت کا پانچواں حصہ دار تصور کرنا چاہئے یا صرف یہ سمجھنا چاہئے کہ زمیندار ساہوکار کارخانہ دار اور دستکار کے حصوں میں سے کچھ مقدار انتظامِ مملکت کے استحکام کے لئے سرکار کو ادا کی جاتی ہے۔ بعض حکماء کا یہ قول ہے کہ سرکار خود دولت پیدا کرتی ہے مثلاً سڑکیں بنوالی ہے۔ پُل تیار کرواتی ہے دیگر رفاہِ عام کی صورتوں میں سرمایہ صرف کرتی ہے لہذا تقسیمِ دولت میں ایک خاص حصے کی حقدار ہے جو محصول کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے بعض حکماء اس بات پر مصر ہیں کہ اکثر صورتوں میں سرکار کا سرمایہ غیر بارآور طور پر صرف ہوتا ہے۔ بڑی بڑی فوجیں اور جنگی جہاز رکھنے کی اصلی غرض یہ نہیں ہوتی کہ ملک میں امن و امان قائم ہو۔

جس سے قوم کا ہر فرد مطمئن ہو کر اپنے کام میں لگا رہے بلکہ اس ساز و سامان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ سلطنت کا دائرہ وسیع ہو اور شاہی خاندان کو استحکام اور قوت حاصل ہو۔ علاوہ بریں ادائگی محصول کوئی تبادلۂ دولت کی قسم سے نہیں ہے کہ اپنی خوشی سے سرکار کو ایک شے دی اور کوئی اور شے اس کے عوض میں حاصل کر لی بلکہ رعایا کو مجبور کیا جاتا ہے کہ محصول کی کچھ نہ کچھ مقدار ادا کرے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر دو فریق راستی پر ہیں کیونکہ محصولِ سرکار کی بحث ایک اعتبار سے تقسیم اور دوسرے اعتبار سے صرف دولت کے ساتھ وابستہ ہے۔ سڑکوں پلوں اور دیگر عمارات کی تعمیر جدید تجارتی بندرگاہوں کا افتتاح محصول لگانے کے مختلف طریق اور اس کے جمع کرنے کے وسائل اور نیز اس امر کا فیصلہ کہ آیا کوئی خاص محصول زمین زمیندار کی ذاتی جیب سے نکلتا ہے یا حقیقت میں اس کے ادا کنندے پیداوارِ زمین کو استعمال میں لانے والے لوگ ہوتے ہیں یہ تمام اور اس قسم کے دیگر امور تقسیمِ دولت کی بحث میں آتے ہیں برخلاف اس کے سرکاری اخراجات کے نتائج کا نیک و بد ہونا صرف دولت کی بحث میں آتا ہے۔

اگرچہ مال گذاری سرکار کی کئی صورتیں ہیں مگر اس باب میں ہم صرف دو بڑی صورتوں کا ذکر کریں گے جن پہ غور کرنا ضروری ہے۔

(۱) محصولاتِ زمین۔

(۲) محصولاتِ آمدنی۔

قدیم الایام سے یہ دستور چلا آیا ہے کہ فاتحین مفتوحوں کی پیداوار زمین میں سے کچھ حصہ وصول کریں اور مختلف زمانوں میں اس حصہ سرکار کی مقدار مختلف رہی ہے۔ مگر یہ امر عام طور پر مسلم ہے کہ سرکار واقعی زمین کی خصوصیات

کے لحاظ سے اُس پر ایک خاص محصول لگانے کا حق رکھتی ہے۔ ہمارے ہاں ایک خاص میعاد کے بعد جسکی مقدار آج کل دن بدن زیادہ زیادہ ہوتے جانے کا میلان رکھتی ہے۔ سرکاری طور پر زمینداروں سے محصول کی ایک خاص مقدار ادا کرتے رہنے کا ایک معاہدہ کیا جاتا ہے جسکو بندوبست کہتے ہیں۔ اور جس کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) زمینداری یا تعلقداری اضلاع جہاں زمیندار خود مالگذاری ادا کرتا ہے خواہ زمین کی کاشت خود کرے خواہ اوروں سے کرائے۔

(۲) اضلاع رعیت واری جہاں مزارعین اپنی اپنی مالگذاری خود ادا کریں اور سرکار اور مزارع کے درمیان زمیندار کا واسطہ نہ ہو۔

آج کل ہندوستان میں بعض اہل الرائے مسئلہ مالگذاری پر بڑی گرمجوشی کے ساتھ بحث کر رہے ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کے موجودہ افلاس و ادبار کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں سلسلۂ بندوبست دوامی کو وسعت نہیں دی جاتی۔

دت صاحب جنہوں نے حال میں سرکار ہند کے ساتھ اس اہم مضمون پر خط و کتابت کی ہے فرماتے ہیں کہ بنگال میں بندوبستِ دوامی کے باعث دولت و اقبال نے ترقی کی ہے اور عام لوگوں نے خاصہ سرمایہ جمع کر لیا ہے

؎ پنجاب میں بالعموم حق ملکیت کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) زمینداری۔

(۲) پتی داری۔ (۳) بھیاچارہ۔

مقدم الذکر دو صورتوں میں تمام مالکان دہ مشترکہ طور پر مالگذاری ادا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں تیسری صورت میں ہر شخص اپنی حصہ زمین کی مالگذاری ادا کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مالکان خود کاشت بھی ہوتے ہیں جو اپنی مالگذاری [illegible]

جو مختلف قسم کی صنعتوں میں صرف ہو سکتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ مذکورہ بالا محقق کا ذاتی تجربہ اور ان کی سلسلہ لیاقت بہت بڑی وقعت رکھتی ہے مگر ہماری رائے میں بنگال کی دولت و اقبال کا باعث صرف بندوبستِ دوامی نہیں ہے بلکہ اس کے اور بھی اسباب ہیں جن کی طرف صاحب موصوف نے توجہ نہیں مبذول فرمائی۔ مشرقی بنگال خصوصیت سے زرخیز ہے اور ایسا کم اتفاق ہوتا ہے کہ یہاں بارش بالکل نہ ہو جیسا ہندوستان کے دیگر حصوں میں ہوتا ہے۔ علاوہ بریں صوبہ بنگال میں سن کی پیداوار ہوتی ہے جو ہندوستان میں کسی اور جگہ شاذ ہوتی ہے مزید براں ملک ہندوستان کے اس حصہ میں وسائلِ آمد و رفت بھی بہ نسبت دیگر مقامات کے کامل ہیں۔ باوجود ان باتوں کے ایک سال بارش نہ ہوئی تو بنگال میں ایک خوفناک قحط نمودار ہوا۔ بلکہ یہاں بندوبست کو دوامی کر دینے کا موذی اثر یہ ہوا کہ زمیندار جتنا چاہتے تھے لگان لیتے تھے اور اس طرح بیچارے کاشتکاروں پر بیجا ظلم و ستم ہوتا تھا۔ ان حالات میں سرکارِ ہند مجبور ہوئی کہ مزارعین کے حقوق کی حفاظت کرے اور ان کو زمینداروں کے ظلم سے بچائے۔ پس اس غرض کے حصول کے لئے سرکارِ ہند نے کئی قانون و قواعد وضع کئے۔ لہذا ہمارے نزدیک بنگال کی اقبال مندی زیادہ تر اس صوبے کی جغرافی خصوصیات کی وجہ سے ہے اور کچھ ان قواعد کی وجہ سے ہے جو سرکار ہند نے مزارعین کے حقوق کی حفاظت کے لئے وقتاً فوقتاً وضع کئے ہیں۔ صوبہ بہار میں بندوبست دوامی کی وجہ سے لوگوں کو ۸۰ لاکھ روپیہ سالانہ کی رعایت ہے مگر باوجود اس بات کے گذشتہ تیس سال میں وہاں دو دفعہ قحط نمودار ہوا اور لوگ اس قدر رعایت کے ہوتے ہوئے بھی قحط کا مقابلہ نہ کر سکے پس یہ کہنا کلیتہً صحیح نہیں ہے کہ رقم مالگذاری کا دوامی طور پر مقرر کر دیا جانا لوگوں

میں قحط کا مقابلہ کر سکنے کی قابلیت پیدا کرتا ہے۔

دوسری بڑی صورت مالگذاری سرکار کی محصولات آمدنی ہے یعنی وہ محصول جو آمدنی پر لگایا جاتا ہے۔

اکثر حکماء نے محصولاتِ آمدنی کے متعلق کئی اصول وضع کئے ہیں۔ مگر چونکہ یہ عملاً کچھ بہت مفید نہیں ہیں اسواسطے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔ یہاں صرف اس قدر ذکر کر دینا کافی ہوگا کہ انتظامِ مملکت کے استحکام کے لئے اس قسم کے محصولات کا ہونا ضروری ہے۔ ہاں محصول آمدنی میں اصولاً ایک نقص ضرور ہے کہ آرام طلب اور سست لوگ جو کچھ نہیں کماتے اس کی ادائگی سے بچ جاتے ہیں اور اسکا سارا بار ملک کی آبادی کے اس حصے پر پڑتا ہے جو محنتی یا تجارت پیشہ ہوتا ہے۔

(ب) اکثر تجارتی ممالک میں بعض ایسے افراد ہوتے ہیں جنکی باریک بین نگاہ تجارت کی مد و جذر کو خوب پہچانتی ہے۔ یہ لوگ اصل معنوں میں نہ تاجر ہوتے ہیں نہ کارخانہ دار نہ خردہ فروش نہ تھوک فروش۔ بلکہ بسا اوقات ان کے پاس اشیاءِ فروختنی کے بڑے بڑے ذخیرے بھی نہیں ہوتے۔ صرف اپنی باریک بینی اور تجربے سے معلوم کر جاتے ہیں کہ فلانی شے کی قیمت اتنے عرصہ میں کم یا زیادہ ہو جائیگی اور اسی رائے کے بل پر اشیا کی خرید و فروخت سے بالعموم فائدہ اور بسا اوقات نقصان بھی اٹھا لیتے ہیں۔ مثلاً جب یہ دیکھتے ہیں کہ غلے کی قیمت کچھ عرصے میں بڑھ جانے کو ہے تو جھٹ غلے کے سوداگروں کے ساتھ سودا کر لیتے ہیں اور پھر گرانی کے موسم میں بسا اوقات عظیم الشان فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پیداوار محنت کی ایک بہت بڑی مقدار ہر سال ان لوگوں کے ہاتھوں میں سے گذرتی ہے اور اس وجہ سے قومی دولت کا کچھ حصہ ان تاجر نما افراد کے قبضے میں

جاتا ہے لہذا یہ ایک لحاظ سے گویا دولت کے چھٹے حصہ دار ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے تاجروں کا وجود بالکل غیر مفید نہیں ہے کیونکہ جو شخص اپنی باریک بینی اور تجربے کی وساطت سے مثلاً یہ معلوم کر لیتا ہے کہ فرضاً چار ماہ کے بعد غلے کی قیمت بہت بڑھ جائے گی اور اس رائے کی صحت کے بل پر غلہ خریدنا شروع کر دیتا ہے وہ ایک طرح سے اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ غلے کی رسد زیادہ کرنے کے لئے باہر سے زیادہ غلہ لانا چاہیئے اور نیز موجودہ ذخیرے کو زیادہ کفایت شعاری سے برتنا چاہیئے۔ مختصر یہ ہے کہ اگر تجارت کی یہ صورت مناسب حدود کے اندر رہے تو اس کی وساطت سے اشیاء کی مانگ اور رسد کے درمیان مساوات پیدا ہوتی ہے اور قیمتِ اشیاء کے ناگہانی تغیرات کا اثر زیادہ محسوس نہیں ہوتا۔

حصہ پنجم

باب اول

آبادی - وجہ معیشت

کسی شے کے صرف سے مراد اس شے کے استعمال سے ہے۔ صرف شے عدم محض کا مستلزم نہیں ہے۔ مثلاً جب اینٹوں کی ایک خاص تعداد کا پل بن جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اینٹوں کی تعداد صرف ہو گئی ہے اگرچہ اس صرف سے اینٹیں بالکل فنا نہیں ہو جاتیں تاہم لفظ صرف کے مفہوم میں فنا کا مفہوم شامل ہے اور صرف شے کے معنوں میں اس شے کا انعدام اور تبدیل ہیئت دونوں داخل ہیں۔

بعض حکماء یہ سمجھتے ہیں کہ صرف دولت کی بحث مضامین اقتصاد میں داخل نہیں ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ مورخین کے لئے اس علم کا مطالعہ صرف اسی لحاظ سے مفید ہو سکتا ہے کہ اس کے اصول اور مسائل ان اسباب پر روشنی ڈالیں جن کے عمل سے مختلف اقوام عالم کا عروج و زوال ظہور میں آتا ہے۔ اور اس قدر وہ کے بواعث معلوم نہیں ہو سکتے جب تک کہ اقوام عالم کی دولت اور اس کو صرف کرنے کے مروج طریق نہ معلوم کئے جائیں۔ علیٰ ہذا القیاس ہم اپنی

آئندہ نسلوں کی دولت کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب تک ہمکو یہ معلوم نہو۔ کہ ہم خود کس قدر صرف کرتے ہیں اور کس طرح صرف کرتے ہیں کسی قوم کی آئندہ عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ امر ضروری نہیں ہے کہ اس قوم کی موجودہ دولت کا اندازہ کیا جائے بلکہ زیادہ ضروری اس بات کا معلوم کرنا ہے کہ وہ قوم اپنی موجودہ دولت کو کس طرح صرف کرتی ہے اور اس کی عادات کس قسم کی ہیں ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنی دولت کو اس طرح استعمال کرے کہ اس کے دستکاروں کا ہنر اور ان کی محنت کی کارکردگی روز بروز بڑھتی جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنی دولت کو اس طرح صرف کرے کہ اس کے افراد کی تعداد روز بڑھتی جائے جس سے مفلسی اور بیماری اور دیگر بد نتائج پیدا ہوتے جائیں باوجود ان صریح دلائل کے ہمیں تعجب ہے کہ بعض حکماء اس بحث کو مضامین اقتصاد میں داخل نہیں سمجھتے۔

(۱) دولت کا پہلا استعمال یہ ہے کہ اس کی وساطت سے دستکار کو سامانِ معیشت لباس اور جائے رہائش ملتی ہے تمدن کے ابتدائی مراحل میں دیگر حیوانات کی طرح انسان بھی صرف نباتات اور قدرتی پھل پھول پر گذارہ کرتا تھا مگر انسان کے تمدن کا حقیقی سلسلہ اس دن سے شروع ہوتا ہے جب اس نے آگ کے خواص اور اس کے طریقِ استعمال معلوم کر کے اپنی خوراک کو پکانا شروع کیا۔ علٰے ہذا القیاس رفتہ رفتہ تمدنی ترقی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ انسان برہنہ پہاڑوں کی غاروں اور درختوں کے پتوں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہے۔ اور بجائے ان کے لباس جھونپڑیوں چمڑے کے خیموں اور مکانوں کا استعمال سیکھے۔

(۲) دولت کا دوسرا استعمال یہ ہے کہ اس کی وساطت سے دستکار

کسی باپ کے بچوں کی تعداد زیادہ ہوگی اسی قدر اس کے وسائل آمدنی پر اثر پڑیگا۔ اگر کسی شخص کی آمدنی قلیل ہو۔ اور اس کی اولاد بڑھتی جائے تو صاف ظاہر ہے کہ اس خاندان کی فارغ البالی وہ نہ رہیگی جو پہلے اسے حاصل تھی موجودہ آمدنی تمام افراد کے گذارے کے لئے کافی نہ ہوگی اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ خاندان کی جسمانی حالت میں فرق آجائیگا۔ اور وہ پس انداز بھی جو کسی اڑے وقت کے لئے جمع رکھا ہوگا۔ خرچ ہو جائیگا بلکہ قلت معیشت کی وجہ سے خاندان مذکور میں بعض ایسی بیماریاں پیدا ہو جائینگی جن کا اثر نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتا جائیگا۔ جب کسی قوم میں آبادی مناسب حد سے زائد ہو جاتی ہے تو قدرت خود بخود وبا اور قحط کے تازیانوں سے اسکا علاج کرتی ہے بچے اور بوڑھے اجل کا شکار ہو جاتے ہیں جوانوں کی قوت مردمی میں فرق آجاتا ہے اور قحط بالعموم آبادی کی افزائش کو روکتا ہے مگر محقق واکر کے نزدیک انسانی قبائل کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ وبا اور قحط کے وسائل کسی قوم کی آبادی کو مستقل طور پر کم نہیں کر سکتے۔ وسیع معنوں میں زندگی کا قیام ایک کلیہ قانون کی تابع ہے جسکو فلسفی قانون بقائے افراد قوی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

غالباً تمام حکمائے حال اس امر پر متفق ہیں کہ نظام عالم کا ہر حصہ اس قانون کے عمل سے متاثر ہوتا ہے کیا نباتات کیا حیوانات اور کیا انسان سب کی فنا و بقا کا اصلی راز اسی قانون کا عمل ہے تم جانتے ہو۔ قیام حیات کے وسائل و اسباب ہمیشہ متغیر ہوتے رہتے ہیں پس جب یہ اسباب و وسائل دفعتہً متغیر ہو جائیں اور جانداروں کے کسی خاص طبقے میں وسائل بقا کے تغیر کے ساتھ ہی ان کے مطابق تبدیلی پیدا کر سکنے کی صلاحیت نہ ہو۔ تو صاف ظاہر ہے کہ وہ طبقہ فنا ہو جائیگا اور وہی حیوانات محفوظ رہینگے جو ان وسائل متغیر شدہ میں قائم رہنے کی قابلیت

سکتے ہوں گے مثلاً فرض کرو کہ کسی ملک کی آب و ہوا میں دفعتہً اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے جو چار پاؤں کے حق میں نہایت مضر ہے اس حالت میں صرف وہی چارپائے زندہ رہ سکینگے جنکے قواے میں تبدیل شدہ آب و ہوا کے متحمل ہو سکنے کی قابلیت ہوگی باقی سب فنا ہو جائینگے غرض کہ نظام عالم کے ہر حصہ میں جانداروں کے درمیان ایک قسم کی مصاف ہستی شروع ہے جس میں قوی افراد فتح پاتے ہیں اور ضعیف و ناتوان افراد صفحۂ عالم سے معدوم ہوتے جاتے ہیں۔ مگر محقق واکر کہتا ہے کہ انسان کی بقا و فنا کی صورت میں یہ قانون کامل طور پر عمل نہیں کر سکتا اور وبا و قحط سے جو اس قانون کے عمل کی صورتیں ہیں انسانوں کی تعداد میں کوئی مستقل کمی پیدا نہیں ہو سکتی ان کے نزدیک انسان اور دیگر حیوانوں میں ایک بڑا فرق ہے جو انسان کو اس قانون کے عمل سے آزاد کرتا ہے حیوانوں اور دیگر جانداروں میں جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو اسکو اپنے ماں باپ سے کوئی سروکار نہیں رہتا مگر انسان کی حالت اس سے مختلف ہے نسبی تعلق جو تمدن انسانی میں خاندان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ایک ایسا زبردست رشتہ ہے جو ایک فرد کو دوسرے افراد سے جدا نہیں ہونے دیتا جانداروں کے کسی طبقہ کا کوئی فرد اگر کسی دکھ درد میں مبتلا ہو جائے تو باقی افراد کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی مگر انسانی خاندان کے کسی فرد کو اگر کوئی مرض چمٹ جائے تو باقی افراد نہایت خلوص اور محبت سے اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اسکو موت کے پنجہ سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں الغرض مصاف زندگی جو اور حیوانات میں بوجہ اجنبیت و غیریت جاری ہے انسانی قبائل میں بوجہ یگانگت اور تعلقات نسبیہ کے معدوم ہے اس استدلال سے محقق موصوف یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ انسانی زندگی بوجہ اس یگانگت کے جو تعلق نسبیہ سے پیدا ہوتی ہے مذکورہ بالا قانون کے عمل سے کسی قدر آزاد ہے

مگر ہماری ذاتی رائے حکیم موصوف کے خلاف ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ نسبی تعلقات کی وجہ سے انسان اپنے خاندان کے کمزور اور ناتوان افراد کی حفاظت کرتا ہے اور مختلف افراد انسانی کے درمیان وہ اجنبیت اور غیریت نہیں ہے جو حیوانوں کو قانونِ افراد قویہ کے تحت میں لاتی ہے تاہم یہ اجنبیت اور غیریت مختلف انسانی خاندانوں اور قوموں کے درمیان ضرور موجود ہے اگرچہ ایک خاندان کے افراد کے درمیان نہیں ہے حکیم موصوف کا خیال اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب تمام انسان یہ محسوس کریں کہ وہ ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور نہ صرف یہ محسوس ہی کریں بلکہ عملی طور پر اسکو کر کے بھی دکھادیں ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ تمدنِ انسانی کے سب سے اعلے صورت یہی ہے کہ تمام بنی نوع انسان حقیقی بھائیوں کی طرح زندگی بسر کریں مگر چونکہ نفس الامر میں ایسا نہیں اس واسطے وہ اجنبیت اور غیریت جو حیوانوں میں موجود ہے اور جو ان کو مذکورہ بالا قانون سے متاثر کرتی ہے مختلف انسانی خاندانوں اور قوموں میں بھی موجود ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ حیوانات میں مصافِ زندگی افراد کے درمیان جاری ہے مگر انسانوں میں یہ لڑائی خاندانوں اور قوموں کے درمیان جاری ہے ہر خاندان اور ہر قوم اس مصافِ ہستی میں فتح مند ہونے کی خواہش کرتی ہے اور سب کا یہ قدرتی اور فطری تقاضا ہے کہ حریف کو گرا کر تمام روے زمین کے خود وارث بن جائیں جس طرح اس قانون کے اثر سے حیوانوں کی بعض قدیم قسمیں صفحہ ہستی سے معدوم ہو گئیں ہیں ۔ اسی طرح اس قانون کے عمل سے انسانوں کی قدیم قومیں بھی حرف غلط کی طرح کتاب ہستی سے مٹ گئی ہیں اور اب ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا ۔ بلکہ ہم یہ کہسکتے ہیں کہ غیر مادی اشیاء مثلاً خیالات و مذاہب کا

قیام بھی اسی قانون کے تابع ہے جو خیال یا جو مذہب انسان کے تمدنی حالات اور اس کی عقلی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی نہ کر سکیگا۔ ضرور ہے کہ وہ انسان کی جدید روحانی ضروریات کو پورا نہ کر سکنے کے باعث معدوم ہو جائے۔ پس ہماری رائے میں مذکورہ بالا قانون انسانی قبائل کی صورت میں بھی اپنا عمل بدستور کر رہا ہے۔ اور قحط و وبا اور آبادی کو کم کرنے کے دیگر قدرتی وسائل کو جو اس قانون کے عمل کی صورتیں ہیں۔ اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں تمدنِ انسانی کی ترقی کے لئے نہایت ضروری شرائط ہیں۔

یہاں تک تو ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ آبادی کا مناسب حدود سے باہر نکل جانا افلاس اور دیگر بد نتائج کا سرچشمہ ہے۔ مگر عملی نتائج پر پہنچنے کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ انسانی موت و پیدائش کے درمیان صحیح نسبت کیا ہے۔ یہ ایک ظاہر واقعہ ہے کہ بعض پیدا ہوتے ہیں بعض مرتے ہیں۔ لیکن مشاہدے اور تجربے کی مدد سے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ معمولی اموات وغیرہ کو نکال کر شرح پیدائش فی زن و مرد کیا ہے۔ حکیم بالہتس اپنے مضمون موسوم بہ آبادی میں یہ اصول دریافت کرتا ہے کہ باوجود تجربیات اور ضعف مردمی کے جو بعض صورتوں میں ہوتا ہے انسان کی شرح پیدائش بحساب اوسط یا بالعموم چار بچے فی زن و مرد کے حساب سے ہوتی ہے۔ اور اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ آئندہ نسلوں کی قوتِ توالد و تناسل میں کوئی ضعف نہیں عارض ہوگا تو صاف ظاہر ہے کہ نوعِ انسان کی آبادی کا شجر مندرجہ ذیل طریق پر شاخ در شاخ ہو کر بارآور ہوتا جائیگا:۔

۱ ——— { مرد و عورت کا ایک جوڑا جو حکیم بالہتس کے نزدیک بالعموم چار بچے پیدا کرتا ہے یعنی بحساب اوسط
۲ لڑکیاں اور ۲ لڑکے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ ایک جوڑے سے ... جوڑے پیدا ہوتے ہیں }

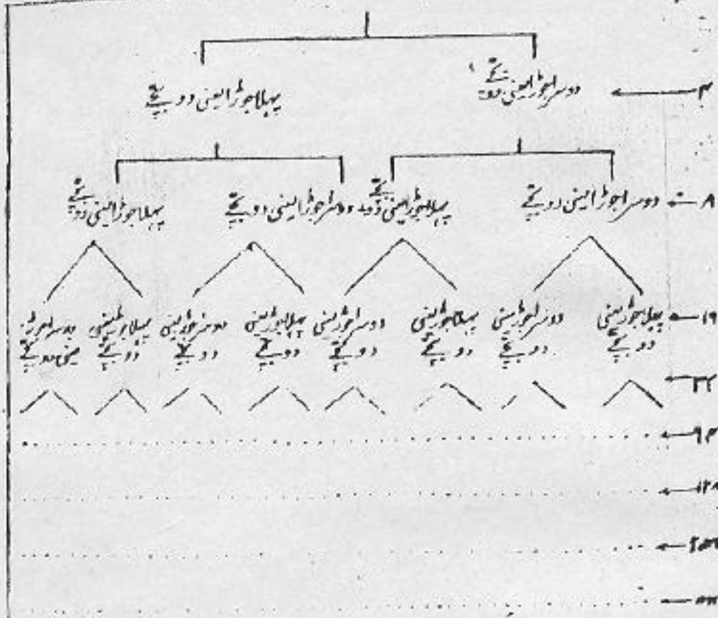

اس سلسلے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ہندسہ اپنے مقدم سے دو گنا ہے پس یہ وہ سلسلہ ہے جو اصطلاح ریاضی میں سلسلۂ ہندسیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لہذا نوع انسان کی آبادی بشرطیکہ کوئی اختیاری یا غیر اختیاری اسباب مانع نہ ہوں سلسلہ ہندسیہ کے مطابق بڑھیگی مگر برخلاف اس کے تم ابھی پیچھے پڑھ آئے ہو۔ کہ پیداوار زمین یعنی خوراک انسانی قانون تقلیل حاصل کے زیر اثر ہے اور اس کی مقدار روز بروز کم ہونے کی طرف میلان رکھتی ہے

له محقق سپنسر نے علم الحیات کے اصول آبادی پر ایک نہایت دلچسپ بحث کی ہے جس میں محقق موصوف نے علم الحیات کے رو سے اس کلیہ کا انکار کیا ہے البتہ اس قدر تسلیم کیا ہے کہ تمدنی ترقی کے خاص مراتب میں اصول مذکور صحیح ہے۔ چونکہ یہ بحث علم الاقتصاد کے مبتدی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس واسطے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں +

لہٰذا اس واقعہ سے حکیم موصوف یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ نوعِ انسان کی آبادی اس قدر بڑھ جانیکا میلان رکھتی ہے کہ قیامِ زندگی کے قدرتی وسائل اس کے لئے کفایت نہیں کر سکتے ذرا خیال تو کرو اگر نوعِ انسان کی آبادی بغیر کسی قید کے بڑھ جائے اور انسان اپنی عقلِ خداداد کی وساطت سے اپنے وسائلِ زندگی کو زیادہ کرنے کی راہیں نہ سوچے تو بنی آدم کا کیا حشر ہوگا - فطرتاً انسان اِس قسم کی رہی ہے کہ اس کے قوائے نظام قدرت کے ان قوائے کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو اسکے قیامِ زندگی کے مخالف ہوں - قدرت عظیم الشان جنگوں وباؤں اور قحطوں کی وساطت سے خود بخود آبادی انسان وحیوان کو کم کرتی ہے اور انسان اپنی انجام بینی کی وجہ سے اپنے شہوانی قوائے پر غلبہ پا سکتا ہے - یا افزائشِ آبادی کی میلان کو اختیاری طور پر بھی روک سکتا ہے حکیم مالتھس کے نزدیک افلاس اور دیگر برائیوں کا اصل منبع آبادی کا انداز سے زیادہ بڑھ جانا ہے اکثر ممالک کے مشاہدے سے معلوم ہوا ہے کہ نوعِ انسان کی آبادی پچیس سال میں دگنی ہو جانے کا میلان رکھتی ہے - جب یہ حال ہو تو جس ملک میں آبادی بلا قید بڑھ رہی ہو - وہاں کے لوگوں کو چاہئے کہ انجام بینی سے کام لیں اور ان وسائل کو اختیار کریں جو آبادی کی ترقی کو روکتے ہیں انسان کی قوتِ توالد و تناسل قدرتاً اس قسم کی ہے کہ اگر اس کے عمل کو اختیاری یا غیر اختیاری اسباب سے روکا نہ جائے تو اسکا وجود مجموعی طور پر بنی آدم کی بربادی اور تباہی کا باعث ہوگا - اجرت کی بحث میں بالعموم یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ جب دستکار افزائشِ آبادی کے بدنتائج کو محسوس کرینگے تو خود بخود ایسے وسائل اختیار کرینگے جن سے آبادی کم ہو - مگر تجربہ اس بات کے خلاف ہے چین اور ہندوستان کی موجودہ حالت یہ ظاہر کرتی ہے کہ غریبی اور افلاس

ہکی صورت میں انسان کی قوتِ تناسل و توالد مزید زور کے ساتھ عمل کرتی ہو جس سے آبادی زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھتی اور مفلسی کے درد کی شدت کو اور زیادہ جان فرسا بناتی ہے اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افزائشِ آبادی کا قدرتی علاج یعنی قحط ان ممالک کو آئے دن ستاتا رہتا ہے۔

باب دوم

جدید ضروریات کا پیدا ہونا

نوعِ انسان کی آبادی کے متعلق مندرجہ بالا خیالات اول اول حکیم مالتھس نے ظاہر کئے تھے۔ حکیم موصوف نے تجربے مشاہدے اور تاریخی شہادت سے اس امر کو ثابت کیا کہ۔

(۱) ہر ملک میں آبادی اس قدر بڑھ جانیکا میلان رکھتی ہے کہ قیامِ زندگی کے قدرتی وسائل یعنی خوراک وغیرہ کی مقدار اس کے لئے کفایت نہیں کر سکتی۔

(۲) بہت کم قومیں اس افزائشِ آبادی کو روکنے کے قابل ہوتی ہیں۔

(۳) اگر آبادی اس قدر بڑھ جائے کہ قیامِ زندگی کے قدرتی وسائل یعنی خوراک وغیرہ کی مقدار اس کے لئے کفایت نہ کرے تو انسان کی قوتِ توالد و تناسل بجائے اس کے کہ اس کا عمل کم ہو۔ مزید زور کے ساتھ عمل کرتی ہے اور آبادی کی مقدار کو اور زیادہ کرتی ہے۔

(۴) اگر فراغت سے زندگی گذارنے کا خیال افزائشِ آبادی کو روکنے سے قاصر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مفلسی اور احتیاج کا خوف بلکہ حقیقی طور پر افلاس کی بیماری میں مبتلا ہو جانا بھی اسکو روک سکے۔

(۵) دنیا کی کوئی قوم ان مصائب کے اندیشے سے آزاد نہیں ہے جو افزائشِ آبادی سے پیدا ہوتے ہیں۔

ان ضروری قضایا کو ثابت کرنے کے بعد حکیم مالتھس ان موانع کا ذکر کرتا ہے جو

افزائش آبادی کو روکتے ہیں اگر یہ اسباب نہ ہوتے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیا دکھ درد کا ایک ایسا خوفناک نظارہ ہوتی ۔ کہ کسی دردمند دل کو اس کے دیکھنے کی تاب بھی نہ ہوتی ۔ بلکہ ان اسباب کے ہوتے بھی کثیر التعداد بنی آدم غربی کی روزافزوں دُکھ میں مبتلا ہیں ۔ جس کی شدت سے مجبور ہو کر ان کو ایسے ایسے جرائم کا مرتکب ہونا پڑتا ہے جو انسان کے لئے ذلت و شرم کا باعث ہیں ۔ اور اس کی صحیح فطرت کے صاف اور روشن آئینہ کو تیرہ تار کرنے کے لئے کافی ہیں ۔ تم جانتے ہو مفلسی تمام جرائم کا منبع ہے اگر ایسی بلائے بے درمان کا قلع قمع ہو جائے تو دنیا جنت کا نمونہ نظر آئیگی ۔ اور چوری قتل قمار بازی اور دیگر جرائم جو اس دہشت ناک آزار سے پیدا ہوتے ہیں یک قلم معدوم ہو جائینگے مگر موجودہ حالات کے رو سے اس کالی بلا کے پنجے سے رہائی پانے کی یہی صورت ہے کہ نوع انسان کی آبادی کم ہو ۔ تاکہ موجودہ سامان معیشت کفایت کر سکے اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر نئے نئے جزائر دریافت ہوتے جائیں جہاں انسان جا کر آباد ہو سکے اور قانون تقلیل حاصل کے اثر کا مقابلہ کامل طور سے کیا جا سکے تو آبادی کی افزائش آسائش انسانی میں خلل انداز نہ ہو سکیگی مگر چونکہ زمین کمیت میں محدود ہے اور اس کی پیداوار کچھ نہ کچھ قانون مذکور کے تابع ہے ۔ اسواسطے ضرور ہے کہ افزائش آبادی کے خوفناک نتائج ہمارے آرام و آسائش کے مخل ہوں ۔ اور ہمیں اس فراغت سے محروم کر دیں جو بصورت کمی آبادی ہمکو حاصل ہوتی ۔ لہذا ہمارا فرض ہے کہ ہم کمی آبادی کے ان اسباب کو عمل میں لاویں ۔ جو ہمارے اختیار میں ہیں کہ ان اسباب کا عمل قدرتی اسباب کے عمل سے متحد ہو کر آبادی انسان کو کم کرے اور دنیا مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو کر عیش و آرام کا ایک دلفریب نظارہ پیش کرے ۔

حکیم مالہتس کے نزدیک آبادی انسان کی ترقی کو روکنے کے وسائل دو قسم کے ہیں۔

(۱) قدرتی یا غیر اختیاری وسائل مثلاً وبا قحط اور جنگ وغیرہ

(۲) اختیاری مثلاً افراد انسانی کا شادی سے باز رہنا۔ اور اپنی تقاضائے نفسانی اور جذباتِ فطری کو قابو میں رکھنا۔ اور دیر کے بعد شادی کرنا۔

اگر ان وسائل کو اس طرح اختیار کیا جائے کہ افزائشِ آبادی پر ان کا پورا اثر ہو۔ تو قدرتی وسائل یعنی قحطوں اور وباؤں کا تواتر خود بخود کم ہو جائیگا کیونکہ قحط خوراک کھانے والوں کی کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور وبا مفلسوں کی کمی خوراک اور ان کی جائے رہائش و لباس وغیرہ کے غیر مصفا ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔

تمدن کے ابتدائی مراحل میں انسانی ضروریات بہت محدود تھیں۔ مگر تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ جہاں پہلے صرف خوراک کی خواہش تھی جب یہ پوری ہوئی تو انسان کو مکانوں کی آراستگی اور ان کے نقش و نگار کی خواہش پیدا ہوتی ہے چونکہ ہر جدید خواہش یہ تقاضا کرتی ہے کہ انسان اپنی کسی اور خواہش کو دبائے رکھے اور اس کو پورا کرے لہٰذا انسان اپنی جدید خواہشوں کے پورا کرنے کی دھن میں اپنی پہلی ضروریات کو محدود کرتا ہے یہاں تک کہ بالعموم اپنی قوتِ توالد و تناسل کو بھی کفایت شعاری سے برتنے لگتا ہے۔ موجودہ زمانے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ماں باپ اپنے بیٹوں کی شادیاں نہیں کرتے جب تک کہ وہ تعلیم سے فارغ نہ ہو لیں بیٹے کی تعلیم کو اس کی شادی پر مقدم سمجھتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات اس خیال کا محرک یہی امر ہوتا ہے۔

کہ بیٹے کی شادی ہو گئی تو اولاد پیدا ہونی شروع ہو جائیگی اور بیٹے کو اپنے بچوں کی پرورش کے خیال سے تعلیم کو خیرباد کہنی پڑیگی۔ صاف ظاہر ہے کہ شادی کو اسی طرح معرضِ التوا میں ڈالنا گویا اولاد کی تعداد کو کم کرنا ہے جو بصورتِ دیگر ایامِ کتخدائی میں پیدا ہونی ممکن تھی۔ علاوہ بریں تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ انسان کو مختلف اقسام کی خورد و نوش اور طرح طرح کی اسباب تن آسانی کی بھی خواہش ہوتی ہے جو اسے محنت کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور اس کی قوتِ تناسل و توالد پر وہ زبردست اثر کرتی ہے کہ مفلسی کا خوف بھی وہ اثر نہیں کر سکتا کیونکہ امیرانہ ٹھاٹھ سے گذارہ کرنا انسان کی ایک جبلی خواہش ہے اور بسا اوقات یہ خواہش اس کو اپنی فطرت کی حیوانی تقاضوں کو پورا کرنے سے روکتی ہے علےٰ ہذا القیاس بعض ممالک میں جہاں کی زمین بالعموم چھوٹے چھوٹے مالکان خود کاشت میں منقسم ہے زمیندار زیادہ اولاد سے گھبراتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جس قدر اولاد کی تعداد زیادہ ہوگی۔ اسی قدر ان کی جائداد زیادہ حصوں میں منقسم ہو گی اور اگر ان کی اولاد کے ہاں بھی اولاد پیدا ہونی شروع ہو گئی تو حصۂ زمین کی وہ قلیل مقدار ان کے گذارے کے لئے کسی طرح کافی نہ ہو گی مگر یاد رکھنا چاہئے کہ افزائشِ آبادی کو روکنے کی خواہش زیادہ زور کے ساتھ اسی صورت میں عمل کرتی ہے جبکہ زمین کی کاشت نقطۂ تقلیل تک پہنچ گئی ہو۔ یا بالفاظِ دیگر جب انسان کو یہ خیال ہو۔ کہ سامانِ معیشت کی مقدار کافی طور پر مہیا نہ ہو سکے گی۔ ان اصول کے رو سے تم خود اندازہ کر سکتے ہو۔ کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کس امر کا تقاضا کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں سامانِ معیشت کم ہے اور آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے قدرت قحط اور وبا سے ہی کا علاج

کرتی ہے مگر ہمکو بھی چاہیئے کہ بچپن کی شادی اور تعدد ازواج کے دستور کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں۔ اپنے قلیل سرمائے کو زیادہ دوراندیشی سے صرف کریں۔ صنعت و حرفت کی طرف توجہ کر کے ملک کی شرح اجرت کو زیادہ کریں اور عاقبت بینی کی راہ سے اپنی قوم کے انجام کی فکر کریں تاکہ ہمارا ملک مفلسی کے خوفناک نتائج سے محفوظ ہو کر تہذیب و تمدن کے ان اعلےٰ مدارج تک رسائی حاصل کرے جنکے ساتھ ہماری حقیقی بہبودی وابستہ ہے ان سطور سے تم نے یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم بنی آدم کو کلی طور پر شادی وغیرہ کی لذت اٹھانے سے روکنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف اس قدر ہے کہ بچوں کی کم سے کم مقدار پیدا ہو اور بال بچے کی خواہش ایک فطری تقاضا ہے اور اس کو بالکل دبائے رکھنا بھی صحت کے خلاف ہے لہذا اقتصادی لحاظ سے انسان کی بہبودی اسی میں ہے کہ وہ حتی المقدور اپنی حیوانی خواہشوں کو پورا کرنے سے پرہیز کرے۔ اور جہاں تک ممکن ہو۔ بچوں کی کم سے کم تعداد پیدا کرے یہ مطلب بڑی عمر میں شادی کرنے یا بالفاظِ دیگر شرحِ پیدائش کو کم کرنے اور نفسانی تقاضوں کو بالعموم ضبط کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

باب سوم

صرف دولت

مضمون گذشتہ کی تصریح کی رو سے جدید ضروریات جو پیدا ہوتی ہیں اس امر کا تقاضا کرتی ہیں کہ انسان اپنی فطرت کے حیوانی تقاضوں کے پورا کرنے کی طرف نسبتاً کم توجہ کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آبادی کی سیل رواں کو مسدود کرنے کے لئے کسی زیادہ زبردست روک کا ہونا ضروری ہے تاہم موجودہ حالت میں جدید ضروریات کا پیدا ہوتے جانا کسی اور روک کے ہونے سے اچھا ہے یہی وجہ ہے کہ انگریزی محققین کے نزدیک جہاں تک ممکن ہو سامان معیشت ارزاں نہیں ہونا چاہئے کیونکہ حکیم مالتھس کے مسائل کے رو سے اشیاء خوردنی کی ارزانی افزائش آبادی کے خوفناک نتائج کی طرف سے انسان کو اندھا کر دیتی ہے اور یہ بے فکری اس کی آئندہ بہبودی کی دشمن ہوتی ہے اگر لوگوں کے روزمرہ استعمال کی اشیاء ارزاں سے ارزاں ہوں تو صاف ظاہر ہے کہ ایک سال فصل کے نہ ہونے سے ان کی جان پر آبنے گی کیونکہ ان کا گذارہ پہلے ہی سے ایسی اشیاء پر تھا جو تمام دیگر اشیاء کی نسبت ارزاں تھیں۔ اور اب اس آڑے وقت کے لئے کوئی ارزاں تر شے نہ ہوگی جس پر وہ اپنا گذارہ کر سکیں لیکن اگر ان کے استعمال کی چیزیں ذرا گراں قیمت ہوں تو قحط سالی میں وہ ارزاں اشیاء پر اپنا گذارہ کر سکیں گے۔ کشمیر میں چاول سب سے ارزاں شے ہوتی ہے اور لوگ بالعموم اسی شے پر گذارہ کرتے ہیں۔

لیکن جس سال چاول نہیں ہوتے ان کو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ اس وقت میں ان کو کوئی ایسی شے دستیاب نہیں ہو سکتی جو چاولوں سے زیادہ ارزاں ہو- اور جس پر وہ اپنا گذارہ کریں جو سب سے ارزاں شے تھی وہ پہلے ہی ان کے استعمال میں تھی اب اس سے زیادہ ارزاں شے کہاں سے آئے لہذا ان حکماء کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ لوگوں کی اشیاءِ خوردنی ارزاں ترین اشیاء نہ ہوں بلکہ کسی قدر گراں قیمت اشیاء ہوں تاکہ اگر ان گراں قیمت اشیاء کا قحط پڑ جائے تو ان ایام میں وہ سستی اشیاء پر اپنا گذارہ کر سکیں۔ حکیم مالتھس کے مسائل کا یہ نتیجہ صحیح ہے لیکن اگر عوام اپنا نفع نقصان سمجھ کر اپنی رضا و رغبت سے آبادی کو کم رکھنے کی کوشش کریں تو صاف ظاہر ہے کہ سامانِ معیشت اور اشیاء خوردنی کی ارزانی بجائے اس کے کہ بُرے نتائج پیدا کرے ان کے حق میں ایک نعمت ہو گی کیونکہ جو روپیہ کھانے پینے سے بوجہ ارزانی کے بچ رہے گا۔ وہ دیگر آرام و آسائش کے سامانوں پر صرف ہو سکے گا یا بطور سرمایہ کام آ سکے گا صرفِ دولت کی مختلف صورتوں کا معلوم کرنا خصوصاً اس حالت میں جبکہ لوگ اپنا نفع نقصان سمجھ کر اپنی رضا و رغبت سے آبادی کو کم کرنے کی کوشش کریں۔ انتہا درجہ کا ضروری ہے کیونکہ صرفِ دولت کی مختلف صورتیں گویا مختلف اسباب ہیں جو دولت کی آئندہ پیدائش پر اثر کرتے ہیں موجودہ محققین اقتصاد کا سب سے بڑا فرض اس بات کا علم حاصل کرنا ہے کہ دولت کے استعمال کے وہ کون کون سے طریق ہیں جن سے تمدن کا شیرازہ مضبوط ہوتا ہے۔ افرادِ قوم کی اخلاقی اور جسمانی حالت ترقی کرتی ہے اور بحیثیت مجموعی ملک کی سیاسی اور اقتصادی نظام کے تمام اجزاء باہم آہنگ ہو کر قوم کی بہبودی کا باعث ہوتے ہیں علی ہذا القیاس یہ دریافت کرنا بھی ضروری ہو کہ صرفِ دولت کی کون کون سی صورتیں تمدنی بہبود

اخلاقی لحاظ سے انسان کی فطرت پر برا اثر کرتی ہیں اور یہ اشیں دولت کے پیچیدہ اسباب کو پورا عمل کرنے سے روکتی ہیں انگلستان میں اس وقت دو ارب ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ صرف شراب پر خرچ ہوتا ہے اگر یہی روپیہ کسی اور مفید صورت میں صرف ہوتا تو ملک کی اقتصادی حالت پر نہایت اچھا اثر کرتا۔ موجودہ زمانے میں ایک ایسے فلسفی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو مندرجہ بالا امور کی پوری تفتیش اور تحقیق کر کے علم الاقتصاد کے اس حصہ کو پورا کرے۔